اظہار و بیان

سحر سنز۔ لاہور، ملتان

اظہاریہ

پروفیسر حسین سحر

سحر سنز

لاہور۔ملتان

ضابطہ

(جملہ حقوق محفوظ)

سالِ اشاعت:.....2010ء

اہتمام:.....الکتاب گرافکس ملتان

ناشر:.....سحر سنز ملتان

طباعت:.....فرید یہ فخریہ پرنٹرز ملتان

قیمت:.....-/400 روپے

ملنے کا پتا

کتاب نگر۔حسن آرکیڈ ملتان چھاؤنی

انتساب

حضرت تاثیر نقوی

حضرت عاصی کرنالی

پروفیسر ملک بشیر الرحمٰن

پروفیسر جابر علی سید

سیّد قدرت نقوی

اور جناب وزیری پانی پتی رحمت اللہ علیہم کی ارواحِ نیک طینت کے نام

ترتیب

شمار	عنوان	صفحہ
	لمحۂ حاضر:	
۱۔	ع۔س۔مسلم کی حمدیہ و نعتیہ شاعری	11
۲۔	خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو (ماہر سے ساحر تک)	32
۳۔	شہاب کاظمی کی ادبی کائنات	40
۴۔	حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں	56
۵۔	ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر	66
۶۔	اقبال ارشد کا سرمایہ حیات	72
۷۔	سوز دروں کا شاعر	76
۸۔	جام کوثر۔شراب طہور سے لبریز جام	81
۹۔	زین صدیقی کی غزل	86
۱۰۔	ثاقبہ رحیم الدین کی کہانیاں	92
۱۱۔	ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟	95
	سخنوران رفتہ:	
۱۲۔	عاصی کرنالی کی رگِ جاں	100
۱۳۔	قتیل جعفری کی شاعری	106
۱۴۔	عزیز کی غزل گوئی	112

۱۵۔ حیدر گردیزی۔شخص وفن 118

۱۶۔ اِحساس کے جلتے دیوں کا شاعر 123

۱۷۔ کشکولِ ہلال 133

اقبالیات:

۱۸۔ اقبال کا تصورِ شاہین 138

۱۹۔ اقبال کا پیامِ خودی 146

۲۰۔ جوانوں کو مری آہِ سحر دے 149

۲۱۔ اقبال خطوط کے آئینے میں 153

۲۲۔ اقبال ایک ملی شاعر 158

۲۳۔ اقبال اور وحدتِ ملی 164

۲۴۔ اقبال اور عشقِ رسول 170

اصنافِ ادب:

۲۵۔ اردو نثر کا ارتقا 176

۲۶۔ جدید اردو نظم 186

۲۷۔ اردو میں مرثیہ گوئی 189

۲۸۔ اردو رباعی 194

متفرق:

۲۹۔ ادیب اور معاشرہ 198

۳۰۔ مرتبۂ حسین ادیبوں شاعروں کی نظر میں 201

۳۱۔ محمد حسین آزاد کی علمی و ادبی خدمات 208

تبصرے:

۱۔ حرف حرف تیشہ 212

۲۔ نئے ذائقے 215

۳۔ کروٹ کروٹ خوشبو 218

۴۔ ادب اور جدلیاتی عمل 221

۵۔ عرفانِ جمیل 223

۶۔ صورت گر 225

۷۔ حدیثِ خواب 227

۸۔ لب گفتار 231

۹۔ اردو کے خوابیدہ الفاظ 234

۱۰۔ لغاتِ سرائیکی 235

۱۱۔ رفتگانِ ملتان 237

۱۲۔ ضبطِ گریہ 240

۱۳۔ کہکشاں کے درمیاں 244

۱۴۔ مرشدِ من 247

۱۵۔ تیری یادوں کے نقوش 249

۱۶۔ وارے نیارے 251

۱۷۔ نعت شفق 253

۱۸۔ اشکِ دوام 254

۱۹۔ گماں 255

ع۔س۔مسلم کی حمدیہ ونعتیہ شاعری

جناب ابوالامتیاز ع۔س۔مسلم دورِ حاضر کے معروف ومقبول ادیب وشاعر، نقاد اور محقق ہیں جہاں نثر کے میدان میں انہوں نے بے شمار تحقیقی وتنقیدی مضامین، دلچسپ سفرنامے، ایک فکر انگیز خودنوشت اور متعدد خوبصورت افسانے لکھ کر اپنے قلم کے جھنڈے گاڑے ہیں۔وہاں شاعری میں، غزل ہو کہ نظم حمد ہو کہ نعت ہر جگہ اپنا لوہا منوایا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دس ننھی منی کتابیں بھی سپردِ قلم کی ہیں۔ان کی یہ تصانیف انہیں ایک مستند اہل قلم منوانے کے لئے کافی ہیں۔چنانچہ ان کی شخصیت اور فن پر ممتاز ناقدین نے متعدد مقالے تحریر کئے ہیں، جو پانچ کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے بارے میں حال ہی میں بھارت کی ایک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا گیا ہے جو ان کے فن کے اعتراف کا واضح ثبوت ہے۔

مسلم صاحب کی ہمہ جہت ادبی شخصیت میں شاعری کا پہلو نمایاں ہے اور شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس میں حمد ونعت کا پلڑا زیادہ بھاری نظر آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اب ان کی ادبی پہچان حمد ونعت کے حوالے ہی سے زیادہ ہے۔وہ حمد ونعت کے ایسے نمایاں شاعر ہیں۔جن کا عصر حاضر کی حمدیہ ونعتیہ شاعری میں ایک خاص مقام ہے۔ان کی حمدیہ ونعتیہ تصانیف میں 'حمد ونعت' ۱۹۸۴ء، اللہ ورسولؐ ۱۹۹۴ء، کعبہ وطیبہ ۱۹۹۳، زمزمۂ سلام ۱۹۹۳، زمزمۂ درود ۱۹۹۳ کاروان حرم ۱۹۸۷ اور واگاں میں ول موڑ (پنجابی نعت) ۲۰۰۰ شامل ہیں۔حال ہی میں ''حمد باری' اور زبورِ نعت'' کے نام سے ان کے دو وقیع مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔جن میں ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا بیشتر حصہ ایک جامع انتخاب کی صورت میں ہے۔آیئے ہم ان کے فکر وفن کا مزاج متعین کرنے کی خاطر ان تصانیف کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

''کاروانِ حرم''

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔یہ حرمین شریفین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) کے سفرِ مقدس کی ایک منظوم روداد ہے۔جسے شاعر نے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سپردِ قلم کیا ہے۔کئی نقادوں نے اسے حج بیت اللہ کا جسمانی اور روحانی سفرنامہ کہا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل نعت ہے اور قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت کے مستند حوالوں نے اسے اور معتبر بنا دیا ہے۔یوں یہ ایک فکر انگیز وقیع اور رفیع تاریخی نظم ہی نہیں۔بلکہ اپنی جگہ ایک ٹھوس تحقیقی وعلمی کارنامہ بھی ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ نظم علم وعقیدت، آگہی وشیفتگی اور قادرالکلامی وبے ساختگی کا بے مثل شاہکار ہے۔مسلم صاحب نے اس کے لئے فارسی کی معروف نظم ''کریما'' کی رواں دواں اور پُراثر بحر کا انتخاب کیا ہے۔جسے ان کے تسلسل فکر اور جولانیٔ علم نے فنی لحاظ سے مثمن کی صورت عطا کی ہے۔یعنی اس کے ہر بند میں آٹھ آٹھ مصرعے ہیں۔یہ سفرنامہ دراصل ان کے مشاہدات وواردات قلبی کی روح پرور داستان۔جسے انہوں نے اپنے تاریخی شعور اور سچی عقیدت سے مربوط کر کے ترتیب دیا ہے۔ان کے بیان میں بڑی مستی اور کیف ہے۔نظم کے مختلف حصے ہیں۔سب سے پہلے شاعر کی طرف سے بصدقِ دل اپنی خطاؤں کا اعتراف ہے۔پھر ان خطاؤں پر ندامت کا اظہار ہے۔اس کے بعد رب العالمین کی بھرپور حمد وثنا ہے اور آخر میں دعائے نجات اور طلبِ مغفرت ہے۔گویا کاروانِ حرم حمد ومناجات، نعت وسلام، توبہ واستغفار اور دعا وفریاد کا ایک سدا بہار گلدستہ ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر جزو سے کُل کی طرف محوِ سفر ہے۔پوری نظم ایک تمثیلی انداز میں ہے۔جس کے پہلے حصے میں شاعر حرم پاک میں یوں حاضر ہے۔جیسے میدانِ حشر میں داورِ محشر کے حضور ہو اور اس کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں ہو۔

چلا ہے حرم کی طرف کارواں — یہ انبوہِ عشاقِ دل خستگاں
صفِ عاصیاں، لشکرِ مجرماں — سروں پر گناہوں کا بارِ گراں
بدامن تہی بادلِ خونچکاں — جگر موجِ خوں، چشم جوئے رواں

حرم ہے کہ محشر کا میدان ہے
مرا منہ ہے میرا گریبان ہے

تصور نے کی ایسی منظر کشی — جو گزری تھی وہ سامنے آ گئی
مصور تھی ہر ساعتِ زندگی — گناہِ مسلسل کی زنجیر تھی
خطا در خطا تھی بہم ہر کڑی — نہ تھی میرے بچنے کی صورت کوئی
کھڑا تھا جہاں میں کھڑا رہ گیا
حیا سے زمیں میں گڑا رہ گیا

شاعر خالق ازل کی بارگاہ میں محض اپنے لئے ہی نہیں بلکہ پوری اُمتِ مسلمہ کے لئے امن و آشتی اور خیر و برکت کی دعا کرتا ہے۔

ترے بابِ عالی پہ سائل ہیں ہم — ذلیل و خجل، خوار و بد حال و خم
مٹا دے دلوں سے زمانے کے غم — گرا دے جو سر پر ہے بارِ الم
بچا فتنۂ دہر سے دم بدم — بہ رحمت ہو بارانِ لطف و کرم
"کریما بہ بخشائے بہر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا"

پھر عاجزی وانکساری اور احساسِ بندگی کے ساتھ حمدِ باری تعالیٰ کا دل پذیر بیان ہے۔

ترے واسطے ساری حمد و ثنا — نہیں کوئی معبود تیرے سوا
ہمیشہ سے تُو ہے، تجھی کو بقا — تجھی سے ہے نعمت، تجھی سے عطا
بہر رنگ ہے تیرا ہی تذکرہ — تجھی کو ہے ہر ایک سجدہ روا
تُو مالک ہے مولا ہے حاضر ہیں ہم
تو ہی رب ہے داتا ہے حاضر ہیں ہم

اس کے بعد ہجرتِ نبوی کا عہد آفریں واقعہ منظر پر ابھرتا نظر آتا ہے۔

محمدؐ کا اپنے وطن سے سفر — ہوا شمع کا انجمن سے سفر

کہ خوشبو کا ٹھہرا چمن ہے سفر — سخن کا حریمِ دہن سے سفر
نفس کا ہے حبسِ بدن سے سفر — کہ دھڑکن کا قلبِ زمن سے سفر
جو مکہ تھا دنیا میں سب سے عزیز
محمدؐ کی کھوئی ہے اس نے تمیز

یہاں شاعر سفر کا ایک ایسا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ جو بے کراں اور مسلسل حرکت سے عبارت ہے۔ ۴۲ بندوں پر مشتمل یہ فلسفہ سفر بجائے خود ایک مستقل حکیمانہ نظم ہے۔

سفر ہے تغیر حضر ہے جمود — دلِ سنگ میں اک شرر کی نمود
سفر سے ہے روشن چراغِ شہود — مسلسل سفر کاروان و جود
سفر بے نیازِ حدود و قیود — سفر زیست میں ارتقا کا عمود
سفر زندگی ہے سفر ہے حیات
دمادم رواں ہے دمِ کائنات

اس طویل نظم کے اشعار کی تعداد ۱۰۰۵ ہے۔ اور اس میں کل ۸۱۷ حوالے دیئے گئے ہیں۔ جو کم و بیش ۱۶۰۰ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے 80 فیصد قرآن حکیم سے ہیں۔ باقی کتب احادیث و سیرت سے لئے گئے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ دوسرا ۱۹۹۱ء اور تازہ ۲۰۰۶ میں شائع ہوا۔ فنی لحاظ سے مسلم ایک پختہ کار شاعر ہیں جنہیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سخت سے سخت زمین میں بھی عمدہ شعر نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تراکیب میں بھی ایک ندرت ہے مثلاً۔

محمدؐ کہ ہے افضل الانبیاء
محمدؐ امامِ سرِ اولیاء
محمدؐ چراغِ دلِ ازکیاء
محمدؐ پرِ عظمتِ اصفیاء

محمدؐ ردائے سرِ اتقیاء
وہی مصطفیٰؐ خاتم الانبیاء
وہ بدر الدجیٰ ہے مرا رہنما
وہ شمس الضحیٰ ہے مرا رہنما

کوئی لفظ یا کوئی صفت ان کے یہاں سند کے بغیر نہیں۔ یوں اُن کی قوت تخلیق کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ تحقیق کی بھی داد دینی چاہیے۔ جہاں ان کے موضوعات میں وسعت ہے۔ وہاں لفظیات میں بھی تنوع ہے۔ اردو کے علاوہ عربی فارسی پنجابی اور ہندی کے الفاظ وہ بڑی بے ساختگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کا لسانی اجتہاد ہے۔ جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب و کامران ہیں۔ مسلم صاحب نے اپنی اس معرکہ آرا نظم کا دیباچہ بھی خود لکھا ہے۔ جو اپنی جگہ ایک شاہکار ہے۔

نظم کے آخر میں ان کا دعائیہ بند دیکھئے۔ جس میں پوری ملتِ اسلامیہ ان کی ہم نوا اور ہم زبان ہو کر شریک نظر آتی ہے۔

رضا کا ہمیں اپنی ادراک دے — فغانِ شب و چشمِ نمناک دے
نگاہِ رسا، فکرِ در اک دے — خیالاتِ عالی، دلِ پاک دے
لبِ صادق وقلبِ بے باک دے — درِ رحمتِ شاہؐ لولاک دے
محبت میں تیری رہے انہماک
کہ ہو عاقبت روشن و تابناک

حرمین شریفین کے اس روحانی اور وجدانی سفر کے بیان میں جو فکری وفنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ سب اس طویل نظم میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کا انداز عالمانہ بھی ہے اور شاعرانہ بھی، یہ نظم اپنے اندر دریا کی سی روانی رکھتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسافرانِ حرم کے قافلے میں مسلم صاحب حدی خوانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ الغرض اپنی نوعیت کی یہ منفرد نظم اُردو

نعت نگاری کے نئے در وا کرتی دکھائی دیتی ہے۔

حمد باری:

مسلم صاحب کے اس مجموعۂ حمد میں ان کی کہی ہوئی اکثر حمدیں موجود ہیں۔ اس کا مقدمہ معروف نقاد ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے مخصوص تحقیقی انداز میں لکھا ہے۔ بقول ان کے اب تک اُردو حمد کے تقریباً پچاس مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ حمد کے ہزاروں نمونے بھی موجود ہیں۔ کیونکہ بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اُردو شاعری میں حمد تمام اصناف میں شروع سے موجود رہی ہے۔ حمد کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔ ''حمد کسی بھی زبان اور کسی بھی شاعر کی ہو۔ اس کے مضامین اور موضوعات کی اساس ایک ہی ہے۔ یعنی خدا کی تعریف۔ خالق کی قدرت اور صنعت کا اظہار۔ ذاتِ باری کے بے پایاں کمالات کا بیان، مخلوقات پر اللہ کے احسانات اور نعمتوں کا بیان۔ موجودے امکانات کے جوہر، کارکردگی، خوبصورتی، اسرار، حیرتیں اور ان سے وابستہ تلازمات ومشاہدات اور محسوسات کا ذکر وغیرہ۔ گویا حمد کے موضوعات کبھی نہ ختم ہونے والے اور ہر ساعت افزوں ہیں۔ انفس وآفاق کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں موجود اور امکان کا سلسلہ در سلسلہ نظام حمد کا موضوع ہے۔ لیکن کما حقہ، حمد کا اظہار پوری کائنات مل کر بھی نہیں کر سکتی''۔

مسلم کی شاعری کے داخلی آہنگ میں مسلسل ایک روانی کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ان کا تخلیقی تموج ایک تواتر کی صورت میں ملتا ہے۔ یوں ہم عصر شاعروں میں وہ ممتاز اور منفرد حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو شعری تموج ان کے یہاں محسوس ہوتا ہے۔ اس کی مثال دوسروں میں کم ملتی ہے۔ مسلم نے اپنے حمدیہ کلام میں بائیس بحریں استعمال کی ہیں۔ جن میں سے اکثر اپنے موضوع کی کیفیت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر مناجات کے لئے ان کا آہنگ

الٰہی تجھی سے ہے میری پکار
بہت ہے گراں سر پہ عصیاں کا بار

عجز وانکسار اور خشیت کے احساس سے معمور ہے۔

مسلم صاحب نے متعدد نئی تراکیب بھی وضع کی ہیں۔مثلاً خوشۂ تسلیم، سدرۂ دل، گردابِ گماں، کشکولِ خیالات، آلودۂ اوہام، اُسوۂ تاباں، سرِ بامِ الست، قافلۂ لفظ وبیاں، ظلمتِ شامِ لحد، صاحبِ خلعتِ سبع مثانی اور اسیرِ لمحۂ قالوبلیٰ وغیرہ جو مطالعے کا الگ موضوع ہیں۔اسی طرح مسلم کے یہاں غزل کے علائم ورموز نے بھی حمدیہ مضامین کو اور پرتاثیر بنادیا ہے۔مثلاً

مجھ کو بطورِ عکس بھی ثانی نہیں قبول
یوں میں نے لوحِ شیشۂ دل چُور چُور کی

اور

دیکھیں ہو کب نصیب میں مسلم بہارِ گُل
ہر سانس ہم نے آگ کی ندی عبور کی

ان کے انفرادی جذبات بھی اجتماعی محسوسات کا حصہ بنتے نظر آتے ہیں۔مثلاً

ع مری فردِ عصیاں سے تُو درگزر کر
ع ہر اک شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں
ع برائی سے یا رب! مجھے پاک کر
ع الٰہی مجھے حاسدوں سے بچا

اور

ع لحد میری معمور ہو نور سے

اوراس کے علاوہ حالاتِ حاضرہ کا درد بھی اس میں شامل محسوس ہوتا ہے۔جو کچھ یوں ہے۔

ہو خاص ترا لطفِ نظر میرے وطن پر
اس مسکنِ اسلام پہ ہوں خاص عنایات

پھر میرے چمن میں ہو فضا امن واماں کی
مومن ہے مہیمن ہے محافظ ہے تری ذات

''حمد باری'' کی ایک اور خوبی اس کا جامع، وقیع اور مبسوط اشاریہ ہے۔جو مسلم صاحب نے آخر میں مرتب کیا ہے۔

الغرض حمد کی صنف جس نزاکت اور احترام کا تقاضا رکھتی ہے۔مسلم صاحب نے اسے مکمل ذمہ داری سے نبھایا ہے۔اس سے جہاں ان کے شعری مقام میں اضافہ ہوا ہے۔وہاں اردو کی حمدیہ شاعری بھی فکری اور فنی اعتبار سے مالا مال ہوئی ہے۔

زبورِ نعت:

''زبورِ نعت'' کے نام سے مسلم صاحب کی نعتیہ شاعری کا انتخاب حال ہی میں شائع ہوا ہے۔''زمیں تا سرِ عرشِ بریں'' کے عنوان سے اس کا مقدمہ خود مسلم صاحب نے لکھا ہے۔جو بذاتِ خود نثری ادب کا شاہکار ہے۔اس میں صنفِ نعت، رفعتِ ذکرِ رسولؐ، نعتِ رسولؐ اور باری تعالیٰ، نعتِ رسولؐ قدیم صحائف میں نعتِ رسولؐ ولادت سے ۸۰۰ سال قبل۔رسولؐ اور مقصدِ حیات، نعتِ رسولؐ باعثِ غفران اور توصیفِ رسولؐ اور تحمیدِ الٰہی جیسے اہم موضوعات کا نہایت عالمانہ انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔رسول کریمؐ کی تصدیق اور تعریف وتوصیف کا سلسلہ ازل سے جاری ہے۔نعت اسی سلسلے کی ایک مقبول اور درخشندہ کڑی ہے۔یہ براہِ راست قلب سے نکلتی ہے اور قلوب پر اثر انداز ہوتی ہے۔یہ اللہ اور رسولؐ کی محبت کا پہلا زینہ ہے۔اس مقدمے کے بعد ممتاز نقاد ڈاکٹر ریاض مجید کا گراں قدر مقالہ ہے۔''زبورِ نعت کا جائزہ'' بقول ان کے اسالیبِ نعت مختلف ہیں۔مثلاً توصیفی انداز، تاریخی انداز، عشقیہ انداز، مقصدی انداز، نعت میں استمداد و استغاثہ کا رنگ۔ایک اسلوب صلوۃ وسلام کا بھی ہے۔ایک انداز خالصتاً علمی بھی ہے جس میں بحیثیت مجموعی یہ سارے اسالیب شامل ہیں۔مثلاً ذاتِ رسالتمآبؐ کا گہرا شعور، آپؐ کی ذاتِ عالیہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ادب واحترام کے تقاضوں کا خیال اور بیان میں حقیقت یعنی مذہبی تاریخی اور واقعاتی صداقت کا لحاظ اس اندازِ نعت میں عقیدت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے عقیدے کو پورے احترام کے ساتھ پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔مسلم کی نعت معاصر نعتیہ منظر نامے میں اس اُسلوب کی نہ صرف آئینہ دار بلکہ نمائندہ ہے۔

''زبورِ نعت''، مسلم صاحب کی اردو نعت گوئی کے غالب حصے پر مشتمل ہے۔ معیار اور مقدار یعنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے یہ مجموعۂ نعت عہدِ حاضر کے نعت کے دیگر مجموعوں میں ممتاز ومنفرد حیثیت کا حامل ہے۔ وہ صفت جو مسلم صاحب کو دوسرے نعت نویسوں سے ممتاز کرتی ہے، ان کی نعت کا علمی انداز اور اس کا مبسوط حوالہ جاتی نظام ہے۔ یہ حوالے جو بیشتر قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت سے ماخوذ ہیں اکثر جگہ متعلقہ خیال کو احسن طریقے سے واضح کرنے کا فریضہ سر انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ مختلف مقامات پر قرآنی آیات کے خوبصورت تراجم بھی قابلِ داد ہیں۔ اسی طرح مسلم صاحب نے بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر سینکڑوں اسمائے مبارکہ سے سرکار دو عالم گویا دکیا ہے۔ یہ نام یا تو قرآن وحدیث سے لئے گئے ہیں۔ یا تشبیہ واستعارہ کے انداز میں انہوں نے خود وضع کئے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن وحدیث کے حوالے بعض جگہ الفاظ کی صورت میں ہیں اور بعض جگہ مفہوم کے اعتبار سے مثلاً

جاؤک اختیار ہے ہاتھوں میں آپؐ کے
کیجیے مجھے نویدِ شفاعت سے شاد کام

یا محمدؐ مصطفیٰ خیر البشر
تیری اعلیٰ شان مازاغ البصر

امرِ حق جیسے ہو کوندا برق کا
لفظِ کن یعنی کلمح بالبصر

ان کے دعائیہ انداز میں ایسا اجتماعی قرینہ ہے۔ کہ عام قاری بھی اس میں اپنے آپ کو پوری طرح شریک اور شامل محسوس کرتا ہے۔ مثلاً

یا محمدؐ مصطفیٰ چشمِ کرم فرمایئے
دل کو گھر کر لیجئے آنکھوں میں رچ بس جایئے

لطفِ نگاہ کیجئے اے رحمتِ تمام!
حُبِ نبیؐ میں خاتمہ بالخیر ہو مرا

دنیا میں میسر ہو اطاعت شہِ دیںؐ کی
عقبیٰ میں ملے قربتِ سرکارِ محمدؐ

مسلم کی نعتوں میں شیفتگی ووارفتگی کا جوہر خوب جھلکتا ہے۔ مثلاً

غزل کے لئے ہو مچلتی طبیعت تو پھر نعت کہئے
محمدؐ کی دل میں ہو جاگی محبت تو پھر نعت کہئے
مقدر ہو ایمان ودل کی حرارت تو پھر نعت کہئے
نظر میں ہو خیر البشر کی زیارت تو پھر نعت کہئے

مسرور ومست حال ہوں شہرِ نبیؐ میں ہوں
یارب بہت نہال ہوں شہرِ نبیؐ میں ہوں

پھرتا ہوں مرغزار میں رحمت کے بے خطر
میں رشکِ صد غزال ہوں شہرِ نبیؐ میں ہوں

محبوبِ رب ہے جو وہی میرا حبیب ہے
ہم ذوقِ ذوالجلال ہوں شہرِ نبیؐ میں ہوں

روضۃ الجنت میں تاباں ہے وہ اک صحرا کا پھول
سینکڑوں گلشن بداماں ہے وہ اک صحرا کا پھول

سکونِ دل کا خزانہ جہاں سے ملتا ہے
چلو مدینے کہ سب کچھ وہاں سے ملتا ہے

درود ورحمتِ حق کی بہار ہے جس پر
تری زمیں کا پتا آسماں سے ملتا ہے

دلوں کے درد کا ذکرِ رسولؐ ہے درماں
حیاتِ روح کا ساماں یہاں سے ملتا ہے

جو مانگنا ہے اسی درے مانگ لے مسلم
خدا کے بعد اسی آستاں سے ملتا ہے

وہ نام کہ آیا تھا نظر باب جناں پر
اس لمحے سے یہ دل ہے طلبگارِ محمدؐ

بقول وصی احمد صدیقی .....نعت لکھنے کیلئے ضروری ہے کہ دل گداز اور قلم رواں ہو۔مسلم کو عام نعت گوشعرا سے زیادہ حسیّت۔گرم جوشی اور گدازِ قلب حاصل ہے۔ان کے قلم میں ہمہ گیری اور وسعت ہے اور ان کے احساسات میں لذتِ فن میں حُسن اور جذبات میں نیکی ہے۔مثلاً

لے کر درِ رسولؐ سے آئی ہے میرے نام
چپکے سے دل کو بادِ صبا نے دیا پیام

پیدا ہوئی ہے صورتِ دیدارِ مصطفیٰ
ہر ہر نفس کے ساتھ ہے ان پر مرا سلام

اس اذنِ حاضری پہ ہوں سوجان سے نثار
پیشِ حضور آپ کے ہے آپؐ کا غلام

مسلم ایک سچے عاشقِ رسولؐ ہیں۔عشقِ رسولؐ ان کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔اُن کی نعت کو ہم ان کا الہام بھی کہہ سکتے ہیں۔جو عقیدت کی چاشنی سے معمور ہے۔مثلاً

رفعتِ شانِ محمدؐ کا یہ ادنیٰ سا نشاں
نقشِ پا سے کہکشاں ہر رہگزر ہوتی گئی

کہاں مجھ سے غنی مسلم جہاں میں
گدائے مصطفیٰ ہوں کامراں ہوں

زندگی کی شب سحر ہوتی نہیں
آپؐ کی جب تک نظر ہوتی نہیں

میں خاکِ پائے سرورِ دیں چھوڑ کر کبھی
ہرگز نہ لوں اگر کوئی مجھ کو خدائی دے
جچتی ہے کب نگاہ میں شانِ سکندری
مجھ کو درِ رسولؐ پہ تاجِ گدائی دے

مسلم صاحب نے رسولِ کریمؐ کا ذکرِ خیر ہندی آہنگ میں بھی پیش کیا ہے۔اس سے جہاں ان کی نعت میں ایک لسانی تنوع پیدا ہوا ہے وہاں عربی فارسی کے ساتھ پنجابی اور ہندی امتزاج نے ان کے آہنگ میں بھی نئے پن کا احساس نمایاں کر دیا ہے۔ان کے یہاں روایت کے ساتھ ساتھ جدت کی مہک بھی موجود ہے۔گویا محسن کاکورویؒ۔امیر مینائیؒ اور مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کے رنگ کے دوش بدوش ان کے کلام میں حالی، اقبال اور ظفر علی خاں کی سی ندرت آفرینی بھی نظر آتی ہے۔ان کے یہاں صداقت کے ساتھ ساتھ جوش اور جوش کے ساتھ ساتھ ہوش بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ الوہیت اور نبوت کی حدود میں فرق و امتیاز رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی میں نبوت و عبدیت دونوں کے کمالات کا مکمل اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شعرا بھی اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

ادب گا ہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جاں

مسلم صاحب کو قدرت نے دل کی مستی کے ساتھ دماغ کی بیداری بھی عطا کی ہے۔ اس لئے جوشِ محبت سے سرشار ہونے کے باوجود وہ افراط و تفریط سے بہت حد تک محفوظ رہے ہیں۔ وہ فرقِ مراتب سے آشنا ہیں یعنی عبد و معبود اور خالق و مخلوق کی حدود سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اندازِ سخن محتاط ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

کٹ گئی ہے ظلمتِ شامِ گماں
صبحِ نو آئی یقیں کے در کھلے

کشتیِ دل لے گئی ساحل کے پاس
ٹوٹ کر جب بندِ چشمِ تر کھلے

نبیؐ کے شہر سے ہو کر صبا نکلتی ہے
لئے شمیم رخِ مصطفےٰ نکلتی ہے

امی لقب رسولؐ کے فیضانِ علم سے
دروازہ ہائے دانش و علم و ادب کھلے

مجھ کو کہاں سلیقۂ حُسنِ طلب نصیب
اُس کا کرم کہ لطف کے در بے سبب کھلے

''زبورِ نعت'' کے آخر میں قرآن و حدیث سے دی گئی اسناد ۳۶ صفحات پر پھیلی ہیں۔ اور اشاریہ اسناد میں ۲۷ کتب کا حوالہ ہے۔ جو یقیناً ایک کٹھن کام ہے۔ یہ تحقیق اور تجسس جوان کے وسیع مطالعے کی دلیل ہے۔ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔

بحیثیت مجموعی مسلم صاحب کی نعت گوئی اُردو نعت کے علمی اسلوب کو آگے بڑھاتی نظر آتی ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ رسول کا وسیع مطالعہ، ذاتِ رسالتمآب کا گہرا شعور اور نعت گوئی کے نازک تقاضے ان کی نگاہ میں ہیں۔ انہوں نے ادب و احترام کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا ہے۔ جو معیاری نعت گوئی کے لئے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعت ایک محتاط انداز میں ہے۔ جو انہیں فکری افراط و تفریط سے بچاتی ہے۔ زبان پر ان کی قدرت، اظہار کے پیراؤں سے آگاہی اور مسلسل مشق و ریاضت ان کے فن کی ایک مستقل خصوصیت ہے۔

زمزمۂ سلام:

''زمزمۂ سلام''، مسلم صاحب کے سلاموں کا مجموعہ ہے۔ خاتم النبیینؐ، شفیع المذنبین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر درود و سلام کی روایت ازل سے جاری ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اور اہلِ ایمان کو بھی اس کی تاکید ہے۔

اردو شاعری میں یہ صنف زیادہ پرانی نہیں۔ قدیم شعرا کے نعتیہ مجموعوں میں سلام کا ایک آدھ نمونہ مل جاتا ہے۔ البتہ بعض شعرا نے مستقل سلام بھی لکھے ہیں لیکن اس سلسلے میں باقاعدہ مجموعوں کی اشاعت کا سہرا مسلم صاحب کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے درود و سلام کے الگ الگ دو مجموعے مرتب کئے ہیں۔ جو ردیف وار ہیں۔

اگرچہ جو مضامین عام طور پر نعت میں بیان ہوتے ہیں۔ تقریباً وہی سلام میں بھی آسکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نعت و سلام دو الگ الگ اصناف ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، سلام نعت سے ایک درجہ آگے کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ نعت میں عموماً عظمتِ رسولؐ اور ان کے ساتھ عشق کا بیاں ہوتا ہے۔ لیکن سلام میں حضورؐ کے فضائل کے ساتھ ساتھ ان پر درود و سلام کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔

مسلم صاحب ایک پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر ہیں وہ نعت رسولؐ کے سلسلے میں ساری نزاکتوں اور نفاستوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اُردو میں ''سلام اس پر'' سے عام طور پر سلام کا آغاز ہوتا ہے لیکن مسلم صاحب نے تمام تر ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جگہ سلام اُن پر لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے سلاموں میں جہاں حضورؐ کے فضائل کا کھل کر بیان کیا ہے وہاں آپؐ کے اخلاقِ حسنہ کا ذکر بھی نہایت موثر انداز میں کیا ہے۔ مثلاً

سلام ان پر ہے ظلِ رحمتِ حق جن کی چادر
مگر ٹوٹا ہوا اک بوریا تھا جن کا بستر

سلام ان پر رضائے حق پہ جو دائم تھے شاکر
صعوبت، صدمہ و اندوہ اور کلفت میں صابر

سلام ان پر کہ وہ دل خستگاں کے چارہ گر ہیں
وہی حرفِ دعا ہیں اور وہی موجِ اثر ہیں

سلام ان پر جو ہیں رمزِ عبودیت کے جوہر
ہوئی خاکِ عرب نقشِ قدم سے جن کے گوہر

سلام ان پر جو پیغامِ ہدیٰ کے پاسباں ہیں
وسیلہ جو ہمارے اور خدا کے درمیاں ہیں

سلام ان پر جو ہیں اسرارِ ربانی سے واقف
خبر افلاک سے لا کر جنہیں دیتا تھا ہاتف

سلام ان پر جنہیں بعدِ خدا دل نے پکارا
وہی تھا میں گے مسلم ہاتھ محشر میں ہمارا

سلام ان پر متاعِ دہر کچھ جن کے نہ گھر تھی
مگر ساری خدائی جن کی محتاجِ نظر تھی

سلام ان پر ہوئی ہے جن سے تکمیلِ مکارم
نگاہِ لطف سے جن کی سنور جاتے ہیں مجرم

سلام ان پر کہ جو ہیں ذو مقاماتِ جلیلہ
ابد تک ہیں نمونہ جن کے اخلاقِ جمیلہ

سلام ان پر جنہوں نے سیدھے رستے پر چلایا
چراغِ نورِ عرفانی سے رستے کو سجایا

سلام ان پر جنہوں نے خوابِ غفلت سے جگایا
شبِ دل میں دیا نورِ صداقت کا جلایا

سلام ان پر جنہوں نے تھام کر آگے بڑھایا
بصد لطف و کرم ہم کو بھٹکنے سے بچایا

سلام ان پر بڑھی انسان کی جن سے قدر و قیمت
کھلی ہے قدسیوں پر ابنِ آدم کی حقیقت

سلام ان پر کہ جن کے ذکر میں ہر لفظ خم ہے
ثناء لکھے محمدؐ کی، کوئی ایسا قلم ہے؟

سلام ان پر کہ جن کی خاکِ پا زیبِ حرم ہے
وہیں ہے روضۃ الجنت جہاں ان کا قدم ہے

سلام ان پر کہ جن کی یاد بستانِ ارم ہے
علاجِ قلبِ آشفتہ ہے درمانِ الم ہے

بارگاہِ رسالتؐ میں اپنی اور اُمتِ مسلمہ کی بدحالی کا بیان بھی سلام کا ایک خاص موضوع ہے۔شاعر حضورؐ کی خدمت میں اپنی قوم کی زبوں حالی اور پریشانی کا اظہار کر کے آپ سے نصرت وامداد کا خواستگار ہے۔مثلاً یہ شعر دیکھئے۔

وطن ہے یا کوئی آشوب گاہِ صد قیامت
کہ ہے دارالاماں میں بھی ترا مسلم ہراساں

لسان ونسل وقومیت کی دیواریں اٹھا کر
اُسارے ہم نے گھر میں امن وعافیت کے زنداں

ہوئی ہے وحدتِ ایمانِ ملت پارہ پارہ
حریمِ ارضِ پاکستان میں ہے رقصِ شیطاں

قدیم دور میں سلام اکثر غزل ہی کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں،یعنی ان میں قافیوں کا التزام غزل کے مطابق رہا ہے۔لیکن دورِ حاضر میں سلام مثنوی کی ہیئت میں بھی ملتے ہیں۔مسلم صاحب کے سلام بھی اسی شکل میں ہیں۔وہ اکثر دونوں مصرعوں میں قافیہ لاتے ہیں۔اسی طرح انہوں نے

اپنے سلاموں میں عربی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے سلاموں میں قرآن وحدیث اور سیرت پاک کے مطالعے کا عکس بھی واضح نظر آتا ہے۔

زمزمۂ درود:

''زمزمۂ درود'' کے نام سے مسلم صاحب کا یہ دوسرا مجموعہ درود وسلام ہے۔جس میں سلاموں کی کل تعداد ۹۶ ہے اور اگر ''زمزمۂ سلام'' میں شامل منظومات بھی شمار کی جائیں تو ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے بھی زائد ہو جاتی ہے۔''زمزمۂ درود'' کے پہلے حصے میں ''رحمتِ عالم'' کے عنوان سے سات سلام ہیں۔ان کے بعد درودِ مسلسل ہیں۔جو ردیف وار ہیں اور اکثر ایک ہی بحر میں ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں معیاری سلاموں کی تخلیق جہاں شاعر کی قدرتِ بیان کا پتہ دیتی ہے۔وہاں فنی لحاظ سے اُسے ایک امتیاز اور انفرادیت بھی عطا کرتی ہے۔درود وسلام کی جو روایت غلام امام شہید،امیر مینائی،احمد رضا خاں بریلویؒ،ظفر علی خاں،اقبال سہیل،بیدم وارثی،حفیظ جالندھری اور ماہر القادری سے ہوتی ہوئی مسلم صاحب تک پہنچتی ہے۔اسے انہوں نے مستقل صورت عطا کر کے اس قدر مستحکم کر دیا ہے کہ مستقبل میں بھی اس روشن سلسلے کے جاری رہنے کا امکان ہے۔

درود وسلام کے انداز میں سیرت نگاری کی مثالیں مسلم صاحب کے یہاں عام ہیں۔''زمزمۂ درود'' سے چند مثالیں نمونے کے طور پر دیکھئے۔

جہانِ نبوت کا وہ آفتاب — بڑھی جس سے سارے رسولوں کی تاب
وہ پیغامِ حق نورِ ام الکتاب — محمدؐ سے کون و مکاں فیضیاب
اسی سے ہدایت کا ہو اکتساب — نہ کوہ و جبل کو ہوئی جس کی تاب
لیا اس کو قلبِ محمدؐ نے تھام
محمدؐ پہ لاکھوں درود و سلام

ذرا والہانہ پن ملاحظہ کیجئے۔

دعا ہے ہمیشہ مدینے میں آؤں — لگی ہے جو دل میں وہ آ کر بجھاؤں
جو مجھ پر گزرتی ہے تجھ کو سناؤں — صبا سے تری بوئے تن مانگ لاؤں

اے روح و تن کی تہوں میں بساؤں　　نشانِ قدم گر ترے دیکھ پاؤں

تو ہر نقشِ پا کو کروں استلام

محمدؐ پہ لاکھوں درود و سلام

درود کا ایک اور نمونہ دیکھئے۔

صلِ علیٰ مبینا　　صلِ علیٰ محمد

صلِ علیٰ شفیعنا　　صلِ علیٰ محمد

واقفِ کن مکاں ہیں آپؐ　　واصلِ لامکاں ہیں آپؐ

رمزِ خدا آشنا　　صلِ علیٰ محمدؐ

فرش سے تا سرِ فلک　　آپؐ کے ذکر کی مہک

خلق و خدا کی اک صدا　　صلِ علیٰ محمدؐ

مسلمِ خستہ کے خدا　　بخشش و عفو ہو عطا

وردِ زباں رہے سدا　　صلِ علیٰ محمدؐ

اور اب الف سے لے کر ی تک ان کے ردیف وار سلاموں میں سے چند مصرع ہائے اولیٰ نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجئے۔ اس سے شاعر کے بیان کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار کے تنوع کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ع سلام ان پر کہ جن کے ذکر میں دل کی شفا

ع سلام ان پر کہ جو ہیں صاحبِ ام الکتاب

ع سلام ان پر کہ جن کے دم سے بزمِ کائنات

ع سلام ان پر ہے شمعِ رہگذر جن کی حدیث

ع سلام ان پر ہو جو ہیں صاحبِ معراج و تاج

ع سلام ان پر مجسم نور ہے جن کا وجود

ع سلام ان پر جو ہیں مہمانِ خاصِ کردگار

ع سلام ان پر ہے جن کا ذکر تکمیلِ نماز

ع سلام ان پر ہے جن کی آسماں تک دسترس

ع سلام ان پر ہوا جن کا جہاں حلقہ بگوش

ع سلام ان پر کہ جن سے دو جہاں ہے مستفیض

ع سلام ان پر قیامت میں ہیں جو سب کے شفیع

ع سلام ان پر ہے جن سے عقل و دانش کو فروغ

ع سلام ان پر کہ جن کا ہر سخن ہے حرفِ حق

ع سلام ان پر جو ہیں محبوبِ ربِ ذوالجلال

ع سلام ان پر ہے بحرِ بیکراں جن کا کرم

ع سلام ان پر کہ جو ہیں رحمت للعالمین

ع سلام ان پر جو ہیں دونوں جہاں کی آرزو

ع سلام ان پر ہے جن سے آب و تابِ زندگی

بقول ڈاکٹر تحسین فراقی ”ایسی ہی شاعری دراصل سحر سے گزر کر اعجاز سے ہمرشتہ ہو جاتی ہے۔ ”زمزمۂ درود“ روشن اور یقین میں ڈوبے ہوئے لہجے کی چاشنی میں کڑھی ہوئی شاعری ہے۔ یہ کیف و سرور کی عطر بیز اور درود افزا شاعری ہے۔ جس میں سپردگی اور والہانہ پن کے گوہرِ شب چراغ بھی ہیں اور استمداد اور استغاثے کی بانگِ بے اختیار بھی۔“

مختصر یہ کہ کاروانِ حرم سے لے کر ”زمزمۂ درود“ تک ابوالامتیاز۔ ع۔ س۔ مسلم کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کا اگر اختصار سے بھی جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حمد ہو کہ نعت سلام ہو کہ درود مسلم صاحب کی شاعری میں خلوص و عقیدت کے روح پرور جذبے کے ساتھ ساتھ ایک مثبت اور تعمیری فکر رواں دواں ہے۔ جو سیرتِ پاک کے گہرے مطالعے کا اثر ہے۔ وہ عہد موجود

کے ان چند صاحب امتیاز اور صاحب اسلوب شعرا میں شامل ہیں ۔ جو علمی انداز کی نعت کہتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ان کے یہاں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اور اسلام کے پیغام ہدایت کی اشاعت ایک مقصد کی طرح کارفرما ہے۔

انہوں نے تقریباً اپنے ہر مجموعے میں خود بھی حرفِ اول کے طور پر کچھ لکھا ہے جو اپنی جگہ دلکش و دل نشیں نثر کا بہترین نمونہ ہے ۔اس کے علاوہ ان کی تمام حمدیہ و نعتیہ کتابوں کے آخر میں تحقیقی اشاریئے اور قرآن و حدیث سے ماخوذ اسناد بھی موجود ہیں اور ان کی افادیت یہ ہے کہ جہاں ان کی مدد سے ان کی شاعری کی بہتر تفہیم ہوتی ہے ۔ وہاں قارئین کی علمی معلومات میں بھی گراں قدر اضافہ ہوتا ہے ۔ یہ ٹھوس علمی کام ان کا ایک مستقل رویہ اور عادت ہی نہیں ۔ بلکہ اب ان کی روایت بن چکا ہے ۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جناب ابوالامتیاز ع ۔س ۔ مسلم فکری اور فنی لحاظ سے دورِ حاضر کے چند اہم حمد نگار اور نعت گو شعرا کی صف میں شامل ہی نہیں ۔ بلکہ کئی اعتبار سے ان میں نمایاں منفرد اور ممتاز ہیں ۔

☆☆☆☆☆

خانوادہ اجتہاد کے مرثیہ گو

سید قائم مہدی نقوی اجتہادی ساحر لکھنوی ممتاز شاعر ادیب، مورخ اور محقق ہیں ۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ آثار روافکار اکادمی پاکستان کے وہ روح رواں ہیں ۔ ان کی تازہ تالیف خوانوادہ ''اجتہاد کے مرثیہ گو'' منظر عام پر آئی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی گیارہ کتابیں ۔ شائع ہو چکی ہیں ۔ جن کی تفصیل یہ ہے ۔ (۱) مرثیہ ۔ قطب شاہ سے ساحر تک (۲) آیاتِ درد (مجموعہ مراثی) (۳) احساس غم (مجموعہ مراثی) (۴) ''علم اور علماء'' (شخصی مرثیہ) (۵) ''علم اور علما'' (مطبوعہ دہلی) (۶) فقہ و شمشیر (مرثیہ مطبوعہ دہلی) (۷) صحیفہ مدحت (مجموعہ قصائد) (۸) یقین کامل (دینی موضوع) (۹) فن تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ ۔ (۱۰) ایمانی شہ پارے (مرتب کردہ) (۱۱) باتیں ہماری رہ گئیں (مرتب کردہ)

شاعری میں مرثیہ ساحر صاحب کا خاص موضوع ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر تخلیقات مراثی کی صورت میں ہیں ۔

خانوادہ اجتہاد برصغیر پاک و ہند کا ایک ایسا علمی و دینی خاندان ہے جس کے علماء نے جہاں مذہب کی خدمت کی ہے وہاں شعراء نے گلستان شعر کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی ہے ۔ اسی خانوادے کے مرثیہ گو شعرا کا تعارف ساحر صاحب کی تازہ کتاب کا موضوع ہے ۔ اس تصنیف میں انہوں نے آغاز میں خانوادہ اجتہاد کے بانی حضرت غفران مآبؒ کا شجرہ طیبہ دیا ہے ۔ پھر اردو مرثیہ کے عنوان سے صنف مرثیہ کے بارے میں اہم علمی اور فنی نکات کو بیان کیا ہے ۔ اس کے بعد خاندان اجتہاد کا تعارف تحریر کیا ہے اور اس خاندان کی علمی و ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے ۔ پھر خانوادہ اجتہاد میں شاعری کا آغاز اور آخر میں اصل موضوع خانوادہ اجتہاد میں مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے جن اہم مرثیہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے ۔ ان میں

حضرت ماہر۔حضرت امیر۔حضرت فاخر۔حضرت جاوید۔حضرت ذاخر۔حضرت خورشید۔حضرت حسین۔حضرت شاعر۔حضرت مہدی نظمی۔حضرت تاثیر نقوی۔حضرت افسر اور خود وہ یعنی ساحر لکھنوی شامل ہیں۔گویا ماہر سے ساحر تک تقریباً ڈیڑھ سو سالہ ادبی تاریخ انہوں نے بیان کر دی ہے۔اس کے علاوہ آخر میں خاندان سے متعلق کچھ اہل قلم کے مختصر تذکرے بھی شامل ہیں۔مثلاً مولوی سید عسکری۔حضرت اختر۔حضرت ناظم۔حضرت عقیل۔مولوی سید زاہد حسن۔حضرت فہیم مولانا سبط حسن اور حکیم آشفتہ۔

آیئے اب متذکرہ بالا مرثیہ نگاروں کے اس تذکرے میں سے ان کے فکر و فن کی مختصر جھلکیاں دیکھتے ہیں۔

خلاق معانی حضرت ماہر لکھنوی (نواب مولوی سید مہدی حسین صاحب تخلص ماہر)

۱۲۶۴ھ تا ۱۳۲۵ھ ایک قادر الکلام اور پر گو شاعر تھے اور زیادہ تر مرثیہ کہتے تھے۔لیکن غزل میں بھی ان کا خاص انداز تھا۔نمونے کے طور پر ایک شعر دیکھئے۔

حیرت مجھے روانیء عمرِ بشر میں ہے
لنگر پڑا ہوا ہے سفینہ سفر میں ہے

ماہر صاحب کی قادر الکلامی کا ایک نمونہ ان کی وہ رباعی ہے جو انہوں نے وفات سے کچھ دیر پہلے کہی۔

کیوں خوش نہ ہوں دل شاد کیا ہے تو نے
سو فکروں سے آزاد کیا ہے تو نے
آواز سے ہچکی کی یہ دیتا ہوں صدا
حاضر ہوں اگر یاد کیا ہے تو نے

اور اب جناب قاسم کے حال میں ۱۰۰ بند پر مشتمل ان کے مرثیے سلطان المراثی میں سے ایک بند دیکھئے۔

وہ وقت صبح وہ دریا وہ کشتیوں کا تھماؤ
وہ ناخدا کا یہ کہنا یہی رہے بہتاؤ
ولی ولی کا وہ غل وہ خلاصیوں کا جماؤ
علی علی وہی پھر، ہاں نکل چلی ہے ناؤ
عیاں ہے سب پہ جو حیدر میں زور باری ہے
وہ در تھا کون سا جس پر سے فوج اتاری ہے

حضرت اُمید لکھنوی (سید محمد جعفر امید) ۱۲۲۵ھ تا ۱۲۹۳ھ

جناب معصومہ قسم کے حال میں ان کے ایک مرثیہ کے چہرے سے ایک اقتباس پیش ہے۔

فکر ثنائے مشہد ذی احترام ہے
وصفِ ریاض روضہ رضوان مقام ہے
ہر فرد رشکِ گلشن دارالسلام ہے
ایک ایک بیت قدر میں بیت الحرام ہے
خامہ کا رکنِ خانہ کعبہ خطاب ہے
پانی نہیں دوات میں زمزم کا آب ہے

حضرت فاخر اجتہادی لکھنوی (نواب مولوی سید اصغر حسین فاخر)

ولادت ۱۸۵۱ء وفات ۱۹۰۹ء

انہوں نے بے شمار مرثیے کہے اور ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ایک مرثیے سے رات کا منظر دیکھئے۔

تاج زر بیر فلک نے جب اتارا سر سے
فوج انجم ہوئی برگشتہ شہ خاور سے
ہو گئی محو شفق بھی فلک اخضر سے
چادر سرخ ہٹی روئے مہہ انور سے
چاندنی چھٹکی زمیں نور سے معمور ہوئی
چشم مہتاب و کواکب کی رمد دور ہوئی

حضرت جاوید اجتہادی لکھنوی (مولوی سید محمد کاظم عرف بندے کاظم) ۱۸۶۴ء تا ۱۹۲۱ء

اپنے وقت کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔

ان کے ایک مرثیے کے چہرے کا ایک بند پیش ہے۔

کون دنیا میں نہیں آج ثنا خواں مرا
بس کہ جو دل میں رہے وہ نہیں ارماں میرا
دہر کی تیز ہوا سے نہیں نقصان میرا
منہ چھپا لے گا چراغ تہہ داماں میرا
سوزِ غم بھی سببِ کارِ نمایاں ہو جائے
یوں نفس ہو تہہ و بالا کہ چراغاں ہو جائے

دعبلِ ہند حضرت ذاخر اجتہادی لکھنوی ۱۲۸۸ھ تا ۱۳۵۳ھ

(مولوی سید فرزند حسن ذاخر)

انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن مرثیے پر خاص توجہ تھی۔ ایک مرثیے میں منظر نگاری کا انداز دیکھئے۔

جب انتہائے شام مصیبت گزر گئی
بیتا بیوں کی ملک عدم تک خبر گئی
ٹھنڈی ہوا سے یوں تپ فرقت اتر گئی
جو دل کی آگ تھی وہ چراغوں کے سر گئی
حدت جگر کی لعلِ سرتاج ہو گئی
شعلے کو کوہ طور پر معراج ہو گئی

حضرت خورشید اجتہادی لکھنوی ۱۲۷۴ھ تا ۱۳۱۹ھ

مولانا سید محمد اصطفیٰ عرف مولوی لڈن صاحب انہوں نے کم و بیش پچاس مرثیے کہے۔

ایک مرثیے میں سے گھوڑے کی تعریف میں ایک بند پیش ہے۔

وہ جھوم جھوم کے چلتا تھا چال مستانہ
ہر ایک دیدہ گلگوں تھامے کا پیمانہ
نہ کیوں ہو دیکھنے والے کا قلب پروانہ
شرارت اس میں تھی مثل نگاہ جانانہ
کلیجے ٹکڑے تھے عشاق کے کتاں کی طرح
ہزار رنگ بدلتا تھا آسماں کی طرح

حضرت حسین لکھنوی

(سید صادق علی عرف جھنگا صاحب) ۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۰ء

حضرت عباسؑ کے حال میں ایک مرثیے سے صبح کی منظر کشی اس بند میں دیکھئے۔

جب شورِ آمد آمد مہرِ مبیں ہوا
ہم رنگِ خوں شفق سے سپہر بریں ہوا
کافورِ صبح غازہ روئے زمیں ہوا
ذرہ ہر ایک غیرت در ثمیں ہوا
بے نور ماہتاب کا خالی ایاغ ہے
ذرہ ہر ایک اب گہر شب چراغ ہے

لسان الشعراء حضرت شاعر اجتہادی لکھنوی ۱۸۸۹ء تا ۱۹۵۷ء

(مولانا سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب قبلہ) ہر صنف سخن میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن مرثیہ گوئی خاص میدان تھا۔ "مرثیہ اسلام اور مزدور" کے مطلع کا بند ملاحظہ فرمائیں۔

فاقہ کش بھی تھے نبیؐ فاتح و منصور بھی تھے
عزت خاک بھی تھے مطلع و انور بھی تھے
ان کے گھر دولتِ کونین سے معمور بھی تھے
حق کے محبوب بھی تھے خلق کے مزدور بھی تھے
ہو اشارہ تو قمر شق ہو رسالت ایسی
سنگ خندق سے اٹھاتے ہیں مشقت ایسی

انیس عصر حضرت مہدی نظمی اجتہادی لکھنوی ۱۹۲۳ء تا ۱۹۸۷ء

(سید ابن الحسن عرف شنے صاحب قبلہ)

ان کے ایک مرثیے میں جناب علی اکبر کے سراپا کا حال اس بند میں ملاحظہ ہو۔

روشن نگاہ جیسے چراغ خدا کی لو
روشن جبیں کہ جیسے مہ وکہکشاں کی ضو
روشن ضمیر خلد میں کوثر کی جیسے رو
روشن دماغ پر تو خورشید صبح ِ نو

نازک ہے جو حسینؑ کے احساس کی طرح
جرار ہے جو حضرت عباسؑ کی طرح

حضرت تاثیر نقوی ۱۹۲۰ء تا ۱۹۸۷ء

(سید محمد مہدی مظفر حسن) تمام اصناف سخن میں قادرالکلام تھے لیکن دینی ادب پر ان کی خاص توجہ تھی۔

تمام اصناف سخن میں قادرالکلام تھے۔ دو مرثیے ''لب جبریل'' اور ''آیاتِ حق'' مسدس ''مولائے کائنات'' اور ایک مختصر مرثیہ ''صدائے غم'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔

''لب جبریل'' کا مطلع دیکھئے

ہر انقلاب خیر کے بانی حسینؑ ہیں
کردار میں رسول کے ثانی حسینؑ ہیں
محبوبہ ازل کی جوانی حسینؑ ہیں
زندہ ہے جس سے حق وہ کہانی حسینؑ ہیں

مشکل پسندیاں کوئی آسان تو نہیں
کیسے رہیں خموش یہ قرآن تو نہیں

اور اب حضرت عباسؑ کی شان میں یہ بند ملاحظہ کریں۔

وفا کا قلب وفا کا جگر وفا کا ضمیر
وفا کی روح وفا کا لہو وفا کا خمیر
وفا کا ذہن وفا کی نظر وفا کا بصیر
وفا کی سیف وفا کا علم وفا کا امیر

زمین پر ہے وفاؤں کا آسماں عباسؑ
جہاں جہاں ہیں وفائیں وہاں وہاں عباسؑ

حضرت افسر اجتہادی لکھنوی ۱۹۰۶ء تا ۱۹۸۵ء

(نواب سید افسر حسین صاحب)

ان کے ایک مرثیے میں تلوار کی تعریف کا ایک بند دیکھئے۔

مجبور ہو کے شاہ نے تلوار کھینچ لی
اٹھی جو ذوالفقار فضا میں لکھا علی
حملہ سے فوج شام میں تھی ایک کھلبلی
اعدا کی موت پھر تو نہ نالے سے بھی ٹلی

ناگن تھی ایسی کاٹے کا جس کے جیا نہیں
دشمن کو بھاگنے کا بھی موقع دیا نہیں

حضرت ساحر لکھنوی (ولادت ۱۹۳۱ء ان کے قلم کو نظم ونثر میں یکساں قدرت حاصل ہے۔

مرثیے کے علاوہ دیگر رثائی اصناف سخن مثلاً سلام نوحہ رباعیات وقطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔لیکن مرثیے میں اختصاص کے حامل ہیں۔خاندان اجتہاد کے آخری مرثیہ گو ہیں۔ ساحر صاحب کی مرثیہ نگاری پر مولانا سید محمد باقر شمس صاحب لکھتے ہیں۔

ساحر لکھنوی کے مرثیے تمہید میں تو جدید مرثیوں کی طرح ہیں۔لیکن انہوں نے اپنے مرثیوں کو مرثیہ باقی رکھا ہے اور ان میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو واقعہ کربلا کے متعلق ایک مرثیے میں ہونا چاہئیں ان کے مرثیوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اور اصناف سخن کی طرح ان کا ایسا مرثیہ گو بھی برصغیر میں نہیں ہے۔

نمونہ کلام کے طور پر ایک مرثیے میں رجز کا ایک بند دیکھئے۔

ہم کون ہیں یہ اچھی طرح جانتے ہو تم
آنکھیں تمہارے منہ پہ ہیں پہچانتے ہو تم
اس کے پسر ہیں جس کو نبی مانتے ہو تم
کلمہ اسی کے نام کو گردانتے ہو تم

دنیا میں آج نائب احمدؐ ہمیں تو ہیں
قولِ نبی سے چوتھے محمدؐ ہمیں تو ہیں

اور مصائب کا ایک بند پیش ہے۔

یہ کس نے آمدِ قاسم کی مجھ کو دی تھی خبر
کہاں ہے وہ مراد ولھا وہ میرا لخت جگر
یہ کیا ہوا مجھے آتا نہیں ہے کچھ بھی نظر
تڑپ کے بولیں یہ بھاوج سے زینبؑ مضطر

وہ جو عبا میں تن پاش پاش ہے بھابی
وہی تو آپ کے بیٹے کی لاش ہے بھابی

حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں نسیم امروہوی۔قیصر بارہوی۔وحید الحسن ہاشمی اور شاہد نقوی کے بعد مرثیہ ان کے دم سے زندہ ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے اور ان کے قلم کی جولانی کو سلامت رکھے۔آمین۔

غرض اس کتاب کی تالیف سے جہاں انہوں نے رثائی ادب کے علمبردار ایک عظیم علمی و ادبی خانوادے کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔وہاں ادبی تاریخ اور تحقیق کا بھی حق ادا کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

شہاب کاظمی کی ادبی کائنات

سید سخاوت احمد شہاب کاظمی کا شمار ان اہل قلم میں ہوتا ہے۔جو عرصہ دراز سے بیرون ملک قیام پذیر ہیں اور دیارِ غیر میں مسلسل تصنیف و تالیف کے ذریعے اردو ادب کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں۔اب تک ان کی نو کے قریب تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱)	ترے تیر نیم کش کو	(مجموعہ غزلیات)۱۹۸۶ء
(۲)	مہر کے پرتو سے	(مراثی)۲۰۰۱ء
(۳)	یہ خلش کہاں سے ہوتی	(نظم وغزل)۲۰۰۱ء
(۴)	میری قلمرو سے	(کربلائی ادب)۲۰۰۱ء
(۵)	کوئی میرے دل سے پوچھے	(غزلیات)۲۰۱۰ء
(۶)	سودا ہے جواہر کا	(مراثی ومسدس)۲۰۱۰ء
(۷)	ورق تمام ہوا	(حمد ونعت وقصائد)۲۰۱۰ء
(۸)	جب تک یہ چمک	(قصائد ومناقب اسلام)۲۰۱۰ء
(۹)	سرتاپا سخن	(تذکرہ)۲۰۱۰ء

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کی تصانیف میں ایک نثری کاوش ہے۔جبکہ باقی آٹھ شاعری پر مشتمل ہیں۔اور ان میں بھی تین نظم وغزل اور پانچ دینی ادب کے مجموعے ہیں۔یوں دینی ادب کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔آیئے اب موضوع وار ان تصانیف کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

غزل ونظم پر مشتمل ان کے تین مجموعے ہیں تیرے تیر نیم کش کو، یہ خلش کہاں سے ہوتی اور کوئی میرے دل سے پوچھے۔جو بالترتیب ۱۹۸۶ء، ۲۰۰۱ء اور ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے۔ان کتابوں کے نام سے ظاہر ہے کہ شہاب صاحب غالب سے کس قدر متاثر ہیں اور صرف نام ہی

نہیں ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی غزل پر بھی غالب کا اثر نمایاں ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ عظیم شعراء کا اثر نہ صرف ان کے معاصرین قبول کرتے ہیں بلکہ ان کے بعد آنے والوں پر یہ اثر اکثر زیادہ ہوتا ہے۔ شہاب صاحب نے اپنی ہر کتاب پر کسی اور سے دیباچہ یا پیش لفظ لکھوانے کی بجائے آغاز میں خود اپنی طرف سے چند صفحات لکھے ہیں۔ جن سے قاری کے لئے ایک تو ان کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرے کسی نقاد کی رائے سے متاثر ہونے کی بجائے اسے براہ راست کلام سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خود ان کا شعر ہے۔

شعر لکھتا ہے جب شہاب کوئی
شعر غالب نظر میں رہتا ہے

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ان کی غزل پر غالب کا اثر نمایاں ہے۔ ڈکشن سے لے کر موضوعات تک یہ غزل لہجے میں ترقی پسندوں کے قریب اور رویوں میں ترقی پسندی سے دور ہے اس لئے کہ اس غزل میں روایت کا احترام بھی ہے اور عہدِ رواں کے تقاضوں کا لحاظ بھی۔

نمونے کے طور پر ان کی غزلوں میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جنہیں با آسانی لحہ حاضر کی غزل کے کڑے سے کڑے انتخاب میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

بغیر وجہ بھی دیکھی ہے دشمنی ہم نے
ازل سے جیسے دئے کی ہوا مخالف ہے

بکھر جائے نہ رسوائی کی خوشبو سارے عالم میں
ہمارا نام تک اپنے فسانوں میں نہیں رکھنا

راحتیں جب بھی بٹیں گی آسماں سے حسبِ ظرف
نام میرے گردشِ ایام لکھ دی جائے گی

میرا مزاج ناشناس ایک جلا ہوا چراغ
اس کا مزاج آشنا ایک دیا بجھا ہوا

سرمژہ نہیں آتے حریت دل کہنے
صدف سے ربط یہ موتی زیادہ رکھتے ہیں

یوں بھی ہو گا قافلہ منزل پہ ہو گا ایک دن
دور منزل سے امیر قافلہ رہ جائے گا

کچھ ایسے انقلاب قیادت میں آ گئے
پچھلی صفوں سے لوگ امامت میں آ گئے

دل تو اکثر مجھے اس موڑ پہ لاتا ہے مگر
میرے آنسو مجھے رسوا نہیں ہونے دیتے

رو لئے چشم سوکھی رہی
ہنس دیئے آنکھ تر ہو گئی

میں ہوں صیدِ ناوکِ عاشقی میں شکارِ خنجرِ دوستی
کوئی ہو تو دے مجھے آگہی کہیں اسکی کوئی دوا بھی ہے

روشنی کی خواہش میں گھر جلا نہیں سکتا
تیرگی کے بارے میں سوچتا تو میں بھی ہوں

ہونٹوں سے لے گیا تھا ہنسی تو کوئی رفیق
آنکھوں سے آنسوؤں کی نمی کون لے گیا

ایک ہی تصویر ہے جب تک سلامت ہے ضمیر
ٹوٹ جائے گر یہ آئینہ تو تصویریں بہت

اس کشمکش میں خود سے بیگانے ہو گئے ہم
اپنا خیال رکھنا، ان کا خیال رکھنا

ہم پہ پتھر اچھالنے والا
خود بھی شیشے کے گھر میں رہتا ہے

ان اشعار میں تغزل بھی ہے ترنم بھی اور تفکر بھی ہے اور تدبر بھی ۔غم جاناں کی کسک بھی ہے اور غم دوراں کی دمک بھی۔

زبان وبیان کے لحاظ سے شہاب کی غزل سادہ مگر پرکار ہے اس میں بول چال کا گداز بھی ہے اور سہل ممتنع کا انداز بھی سہل ممتنع کی مثال دیکھئے

ٹھہرو رک جاؤ میری بات سنو !
تم سے کچھ کہہ رہی ہے رات سنو !

غالب کی ایک معروف غزل کی تضمین بھی انہوں نے کی ہے ۔ایک شعر کی مثال ملاحظہ کریں

نہ کوئی فریب دینا نہ کوئی فریب کھانا
غم زندگی کا شاید کوئی اور ہے بہانا
کوئی سہل تو نہیں تھا تجھے بات یہ بتانا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

زبان کے معاملے میں انہوں نے کچھ فنی تجربے بھی کئے ہیں ۔مثلاً ان کی ایک غزل مہملہ

میں سے دو شعر دیکھئے۔

دل دل کے یہ قصے وہے بات پرانی ہے
کہو اگر کہنے وہنے کو نئی کہانی ہے

اور

رسوائی کا ڈر ور ہے تو ہونٹ ووںٹ سی لیجے
کیوں کہئے سینے وینے میں درد نہانی ہے

ایسی ایک اور غزل کے دو شعر ہیں ۔

ترکِ وفا کی قسم وسم سب بھول گئے
شکوے شکایت ستم وتم سب بھول گئے
عشق میں پڑ کر شعر وعر تو الگ رہے
کاغذ واغذ قلم ولم سب بھول گئے

اسی طرح انہوں نے غالب کے علاوہ دیگر معروف اساتذہ کی غزلوں کی توسیع بھی کی ہے جو یقیناً ایک نادر تجربہ ہے ۔توسیع یہ ہے کہ شاعر کے اشعار کا کوئی لفظ چھوٹے نہیں اور ان کی معنویت بھی تبدیل نہ ہو۔اس سے البتہ بحر بدل جاتی ہے۔مثال کے طور پر مختلف اساتذہ کی غزلوں میں سے ایک ایک شعر کی توسیع دیکھئے۔

(بتا ہم کو) دلِ ناداں تجھے (صدمہ) ہوا کیا ہے؟
(علاج اس کا ہے کیا) اس درد کی آخر دوا کیا ہے؟

(غالب)

(وائے حسرت) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
(اور بیٹھے) ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

(غالب)

ہے تنک ظرفوں کو بے جا (اشتیاق) مے کشی
جام مے (کا ہم صفت) کب ہو سکے جام حباب

(سودا)

تہمت چند اپنے ذمے (دیکھئے ہم) دھر چلے
جس لئے آئے تھے (اس دنیا میں) ہم سو کر چلے

(درد)

(لحہ لحہ) قافلے میں صبح کے اک شور رہے
یعنی غافل ہم چلے (تو اب تلک) سوتا ہے کیا؟

(میر)

(چہرہ) ہے (کہ) ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو ذرا تہِ نقاب کیا ہے

(مصحفی)

بیت ہیں (میرے کہ ہیں) دوا بروئے زیبائے یار
مصرع برجستہ ہے (میرا قد) بالائے یار

(آتش)

(یہ) وقت پیری (میں عہد) شباب کی باتیں
(یہ باتیں) ایسی ہیں جیسی (کہ) خواب کی باتیں

(ذوق)

وعدہ وصلت سے (اپنا) دل (بھلا) ہو شاد کیا
(اور) تم سے دشمن (جاں) کی مبارک باد کیا

(مومن)

غزل کے علاوہ شہاب صاحب نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں جو ان کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ان نظموں کے موضوعات زیادہ تر سیاسی اور سماجی ہیں۔مثلاً وطن۔کرسی۔موسم کے شب و روز اور تلقین وغیرہ۔اس کے علاوہ مختلف شخصیات کے لئے قطعہ ہائے تاریخ بھی انہوں نے کہے

ہیں۔جو ان کی قادرالکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

غزل و نظم کے مجموعوں کے علاوہ شہاب صاحب کی کائنات شعری میں ان کے پانچ ایسے مجموعے ہیں جو دینی ادب پر مشتمل ہیں۔یعنی حمد و نعت۔منقبت۔سلام۔نوحے اور مرثیے اور یہی ان کی شاعری کا غالب حصہ ہے۔ان کی دینی شاعری پر فکری اور فنی لحاظ سے میر انیس اور علامہ اقبال کے اثرات گہرے ہیں۔ان کے مراثی کا پہلا مجموعہ ''مہر کے پرتوے'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔جس میں ان کے بارہ مرثیے شامل ہیں۔جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(۱)	زمین کی زبانی ۱۹۸۵ اور احوال کربلا و حضرت عباس علمدارؑ	تعداد بند ۹۶
(۲)	آشوب ہنر ۱۹۹۰ء اور احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۳۰
(۳)	سفر ۱۹۹۲ اور احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۳۶
(۴)	درس حیات سفر ۱۹۹۴ اور احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۳۲
(۵)	گفتگو ۱۹۹۵ اور احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۱۴
(۶)	آگہی ۱۹۹۶ اور احوال کربلا و حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۴۰
(۷)	زخم انا ۱۹۹۷ اور احوال کربلا و جناب قاسم بن حسنؑ	تعداد ۱۳۵
(۸)	مباہات ۱۹۹۹ اور احوال کربلا حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۲۷

اس کے علاوہ سوز خوانی کے لئے چار مختصر مرثیے جناب امیرؑ، جناب علیؑ اکبر، جناب علی اصغر اور جناب عون و محمد کے حال میں ہیں۔

اس مجموعے کے بعد ''سودا ہے جواہر کا'' کے نام سے ان کے مراثی و مسدس کا ایک مجموعہ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔جس میں ان کے پانچ مرثیے شامل ہیں۔جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱)	تلخابہ حق ۲۰۰۲ء و احوال رہائی اہلِ حرم	تعداد بند ۱۱۳
(۲)	اذان حریت ۲۰۰۲ء و احوال جناب حر ریاحی	تعداد ۱۳۷
(۳)	خودنمائی ۲۰۰۸ء و احوال حضرت امام حسینؑ	تعداد ۱۶۳
(۴)	مرسلؐ و شبیرؑ ۲۰۰۹ و احوال حضرت امام حسینؑ و نعت سرور	تعداد ۱۰۲
(۵)	جلوہ دل ۲۰۰۹ء و احوال حضرت عباس علمدارؑ	تعداد ۸۴

ان کے علاوہ پانچ مختصر مسدس ہیں جو اسیری اہل حرم، آمد زوجہ حرجری، چودہ سوسالہ جشن حضرت عباسؑ، الوداع محرم ولادت مولائے کائناتؑ کے موضوع پر ہیں۔

ان مراثی میں ہمارے رثائی ادب کی سب سے محکم روایت دبستان انیس کی مکمل پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید مرثیے کے مزاج کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔شہاب صاحب چونکہ خود لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔اس لئے زبان کی سلاست اور فصاحت کے اعتبار سے انہیں استناد کا درجہ حاصل ہے۔اور جہاں تک بیان کی بلاغت کا تعلق ہے۔قادر مطلق نے انہیں اس میدان میں بھی قدرت کلام عطا کی ہے۔پھر رثائیت کی روح بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔اس لئے اگر ہم انہیں دور حاضر کے ایک ممتاز مرثیہ نگار کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

نمونے کے طور پر ان کے مراثی میں سے چند اقتباسات دیکھئے۔

مرثیہ زمین کی زبانی سے حضرت عباسؑ کی شہادت پر ایک بند پیش ہے۔

خون بہہ رہا تھا جسم غضنفر سے بے حساب
پر تھا نہ شمہ بھر میں دلاور کو اضطراب
گھائل ہوئی جو تیروں سے ناگاہ مشک آب
دیکھی ہے میں نے پاؤں سے چھٹتے ہوئے رکاب
زیں پر سنبھلنا شیر کو دشوار ہو گیا
حسرت اثر نوشتہ دیوار ہو گیا

''آشوب ہنر'' میں سے حضرت امام حسینؑ کی شان میں ایک بند

جو عرش بندگی کا ستارا تھا وہ حسینؑ
سجدوں کو بوجھ جس کا گوارا تھا وہ حسینؑ
جس کو خدا کے دین نے پکارا تھا وہ حسینؑ
امت کا آخری جو سہارا تھا وہ حسینؑ
ظلمت کی آندھیوں میں جو تنہا چراغ تھا
شاداب جس کے دم سے شریعت کا باغ تھا

''سفر'' میں سے ایک بند پیش ہے

بیعت سے جب حسینؑ نے انکار کر دیا
اظہار برہمی سر دربار کر دیا
عزم بقائے دین کا اظہار کر دیا
اعلانِ جنگ کفر سے اک بار کر دیا
دن نیک تھا نہ سال نہ ساعت سعید تھی
پہلے محاذ پر یہ شکست یزید تھی

''درسِ حیات'' کا ایک بند دیکھئے۔

جس کی رگوں میں حق تھا رواں خون کی جگہ
جس کی جبیں پہ نور نبی کو ملی جگہ
جس کو خدا نے مہر رسالت پہ دی جگہ
قبروں کی جس نے اپنے لئے مول لی جگہ
کل جس پہ منکشف تھی کسی راز کی طرح
انجام جانتا تھا جو آغاز کی طرح

''آگہی'' میں سے ایک بند پیش ہے

صبر و رضا کا منبع و مصدر ہے آگہی
جو دوسنی کے باب کا دفتر ہے آگہی
آئینہ حیات کا جوہر ہے آگہی
ابتر ہے جہل سورہ کوثر ہے آگہی
پیش خدا جھکا ہوا سر آگہی سے ہے
ہر شے کا اعتبار نظر آگہی سے ہے

''تلمحا بہ حق'' میں رہائی اہل حرم کا ذکر ایک بند میں دیکھئے۔

تیرہ مہینے قید میں جب ہو گئے تمام
جو رو جفاء و غیظ و غضب ہو گئے تمام
ایذا رسی کے سارے سبب ہو گئے تمام
ارمان انتقام کے سب ہو گئے تمام
کچھ ایسے وسوسے دل قاتل میں آ گئے
اہل حرم رہائی کی منزل میں آ گئے

''اذانِ حریت'' میں جناب حر ریاحی کے حال میں ایک بند پیش ہے۔

تو خاک سمجھ پائے گا کیا پایا ہے حُر نے
اک چشم تلطف سے خدا پایا ہے حُر نے
کی تھی جو خطا اس کا صلہ پایا ہے حُر نے
مطلب تجھے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے حر نے
مختار ہوں میں اپنا بھلا دیکھ رہا ہوں
اب آنکھ کھلی ہے تو سوا دیکھ رہا ہوں

اور اب مختصر مرثیوں میں سے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

مولائے کائنات کی رخصت کا وقت ہے
زہرا کی دختروں میں قیامت کا وقت ہے
شیعوں پہ یہ شدید مصیبت کا وقت ہے
یعنی غروب مہر امامت کا وقت ہے
جراح کہہ رہے ہیں کہ بچنے کے اب نہیں
یہ رات بھی علیؑ پہ نہ گزرے عجب نہیں

شہاب صاحب کی مسدسوں میں سے کچھ بند دیکھئے۔ اسیریٔ اہل حرم کے احوال میں ایک بند۔

جب شام غریباں کی سحر ہو گئی بن میں
جکڑی گئیں تطہیر کی آیات رسن میں
اولاد نبی قید ہوئی تازہ محن میں
ویرانی سی ویرانی تھی زہرا کے چمن میں
نشہ نہیں اترا تھا ابھی شوق جفا کا
وعدہ ابھی باقی تھا محمدؐ سے وفا کا

چودہ سو سالہ جشن حضرت عباسؑ کے سلسلے میں ایک مسدس کا بند ہے۔

چودہ سو برسوں سے یاد ان کی مناتے آئے ہیں
شہ نشین دل پہ ہم ان کو بٹھاتے آئے ہیں
جذبہ شوق نہایت آزماتے آئے ہیں
اپنی قسمت اور دنیا کو جگاتے آئے ہیں
ان کے پرچم کو اٹھانے میں ستم سہتے رہے
دار پر بھی داستانِ کربلا کہتے رہے

اور ولادت مولائے کائناتؑ کے سلسلے میں ایک بند ہے۔

تیرہ رجب کی آج زمانے میں دھوم ہے
گیتی پہ ساکنان فلک کا ہجوم ہے
دیکھو جدھر عنایت حق بالعموم ہے
رخصت کے بندوبست میں بادِ سموم ہے
تقدیر بن گئی ہے نسیم بہار کی
مدت ہے اختتام پہ اب انتظار کی

مراثی اور مسدس کے علاوہ دینی ادب میں شہاب صاحب نے حمد۔ نعت۔ منقبت۔ سلام

اورنوحے بھی لکھے ہیں۔اورمیری قلمرو سے ورق تمام ہوااور جب تک یہ چمک اس سلسلے میں ان کے مجموعے ہیں ان منظومات میں بھی متعلقہ موضوع کے تقاضوں کوانہوں نے پورے رکھ دکھاؤ سے نبھایا ہےاورزبان وبیان کی سلاست اورروانی کے ساتھ ساتھ فکروفن کی لطافت اور بلاغت یہاں بھی ان کا اختصاص ہے۔گویاان کی یہ شاعری مے ولائے محمد وآلِ محمد سے پوری طرح سرشار ہے۔آیئےاب ان کے دینی ادب میں صنف وار کچھ جھلکیاں دیکھتے ہیں۔

حمد

حمد جس کی علیؑ ولی نے کی
بندگی جس کی خود نبیؐ نے کی
چاند تاروں نے روشنی نے کی
فکر و وجدان و آگہی نے کی
میں کروں اس کی حمد کیا کہہ کر
جگر آتا ہے منہ کو رہ رہ کر

مناجات

محتاج ہے ہر ایک یہاں تیری رضا کا
دیتا ہے تو ہی اذن بھی نالے کو رسا کا
مانگے کوئی تجھ سے تو نہیں دخل حیا کا
مجھ کو نہ سلیقہ ہے ثنا کا نہ دعا کا
پھیلائے ہوئے ہاتھ مگر مانگ رہا ہوں
میں تجھ سے دعاؤں میں اثر مانگ رہا ہوں

نعت

میرے پیروں میں لغزش نہیں ہے میرا دل ہے مثالِ نگینہ
نقشِ پائے محمدؐ پہ چل کر میں نے سیکھا ہے دنیا میں جینا

جسم کو روح کی پہچان نہ سمجھا جائے
پیکرِ نور کو انسان نہ سمجھا جائے

دیکھوں ادھر کو اور نہ دیکھوں ادھر کو میں
کر دوں نثار خاک مدینہ پہ سر کو میں

کوئی دن تو مرا ایسے بسر ہو
حرم میں شام بطحا میں سحر ہو

نور وہ ہم بشر ہم کہاں وہ کہاں؟
رات ہم وہ سحر ہم کہاں وہ کہاں؟
نبی کی چاہ میں جس دن سے کھو گیا ہوں میں
بلند اپنی نگاہوں میں ہو گیا ہوں میں

منقبت

یہ عقیدہ ہی نہیں ہے تجربہ بھی ہے شہاب
جب لیا نام علی حاصل توانائی ہوئی

(قصیدہ جناب امیرؑ)

ثنائے بختن وہ تلوم زخار لگتا ہے
جہاں پر ڈوبنے والے کا بیڑا پار لگتا ہے

(قصیدہ غدیر خم)

محفل میں چھڑ گئی تھی ذرا روشنی کی بات
کیسے مری زباں پہ نہ آتی علی کی بات

(منقبت مولا علیؑ)

اسلام کا ثبات ہیں شیر خدا علیؑ
تقدیر شش جہات ہیں شیر خدا علیؑ
تعبیر ممکنات ہیں شیر خدا علیؑ
مولائے کائنات ہیں شیر خدا علیؑ

(منقبت مولائے کائنات)

جناب فاطمہ زہرا کی مدحت کس کے بس میں ہے؟
قلم لکھے کوئی قرآں کی سورت کس کے بس میں ہے؟

(منقبت جناب فاطمہ زہراؑ)

کرب و بلاتو صلح سے آگے کی بات ہے
باطل کا انہدام امام حسن سے ہے

(منقبت امام حسنؑ)

سر ہے مرا اور حضرتِ شبیر کا در ہے
منزل پہ ہوں میں اورابھی رستے میں خضر ہے

(قصیدہ امام حسینؑ)

پیدا ہوں قیامت کے آثار تو اچھا ہو
آ جائیں کسی صورت سرکار تو اچھا ہو

(منقبت امام عصرؑ)

سلام

حسینؑ ابن علی نے تیغ اٹھا کے کر دیا ثابت
خلافِ ظلم جو اٹھے اسے شمشیر کہتے ہیں

سیاہی سوختہ خیموں کی رنگ خون صغیر
مدام چاہئے تصویر کربلا کے لئے

لوگ جینے کے لئے مشتاق یوں ہوتے نہیں
جسقدر بیتاب تھے قاسمؑ قضا کے واسطے

اس کے آگے خلد کی خوش منظری کا ذکر کیا
جس کی اک ساعت بھی دید قبر سرور میں کٹی

ابھی تو شیر کو رن کی رضا بھی دی نہیں شہؑ نے
سمیٹے پھر رہے ہیں کس لئے جبریلؑ شہپر کو

رشتہ ہے میری روح کا جب تک بدن کے ساتھ
اللہ میرے ساتھ ہے میں پنجتن کے ساتھ

سایہ خیر البشر جس دن سے اٹھا تھا شہاب
تھی اسی دن سے تمام آل پیمبرؐ دھوپ میں

نوحہ

سن کر یہ نوحہ شاہ کا ہاتف نے دی بڑھ کر صدا
اے میر دشت نینوا و احسرتا واحسرتا

عباس کہاں ہو مرے عباس کہاں ہو
رہ رہ کے بلاتی ہے بہن دیر سے تم کو

قطعات

مرتبہ کس کو یہ حاصل ہے سوائے زینبؑ
دیتی تھیں حضرت شبیر کو رائے زینبؑ
بعد قتل شہ دیں بھی نہ رکے ظلم مگر
راہِ حق سے نہ ہوئی جنبش پائے زینبؑ

دل کو وارفتہ دنیا نہیں ہونے دیں گے
سر میں اغیار کا سودا نہیں ہونے دیں گے
میرا ایمان ہے اس پر کہ سر حشر شہاب
میرے مولا مجھے رسوا نہیں ہونے دیں گے

اوراب آخر میں ذکر کرتے ہیں شہاب صاحب کے اس نثری شاہکار جوان کا ترتیب دیا ہوا وہ منفرد تذکرہ ہے جسے ''سرتاپاسخن'' کا نام دیا گیا ہے۔اس تذکرے میں متعدد اساتذہ سخن کے کوائف واحوال ہیں۔مگر نمونہ کلام میں ایسے اشعار دیئے گئے ہیں جن میں جسم انسانی سے متعلق اعضا مثلاً آنکھ۔لب۔عارض۔گردن وغیرہ اوران کے ملحقات بطور ردیف استعمال ہوئے ہیں۔ شعرا کا ذکر تخلص کی بنیاد پر حروف تہجی کی مناسبت سے ہے۔قدما میں ولی اور متاخرین میں جلال کا ذکر سن ولادت ووفات کے علاوہ ان کے شاگردوں کا بھی ذکر ہے۔کتاب کے آغاز میں اردو تذکرہ نویسی کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔پھر فہرست تذکرات اور تفصیلات شعراء کے ساتھ ساتھ جواز تذکرہ اور کچھ شعر گوئی کے بارے میں نکات بیان کئے گئے ہیں۔شہاب صاحب کی یہ کاوش علمی تاریخی اور تحقیقی نوعیت کی ہے اور بیش قیمت علمی اور فنی معلومات سے پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب شہاب کاظمی کی ادبی شخصیت ایک آفتاب روشن کی مانند ہے۔جس کے گرد ان کی تصانیف گردش کرتے ہوئے سیاروں کی طرح ہیں۔یوں ان کی یہ ادبی کائنات لفظ و معنی کی ایسی وسیع کائنات ہے۔جس کا نور دنیائے ادب کو ہمیشہ منور و درخشاں رکھے گا۔ہماری دعا ہے کہ وہ اسی طرح چار دانگ عالم میں اپنے فکر وفن کی روشنی پھیلاتے رہیں۔آمین۔

حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں

عہد موجود کے نوجوان ناقدین اور محققین میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔انہوں نے مسلسل محنت اور ریاضت کے بل پر تھوڑے ہی عرصے میں علمی وادبی حلقوں میں اپنے قلم کا لوہا منوالیا ہے۔ان کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک ایسا راستہ منتخب کیا ہے جس پر بہت کم اہل نظر نے توجہ دی ہے۔انہوں نے جہاں دینی ادب خصوصاً رثائی شاعری کے مختلف گوشوں کو اپنے فکر وفن کا موضوع قرار دیا ہے۔وہاں ایسے اہلِ قلم کی خدمات کو بھی متعارف کرایا ہے جو عام ناقدین کی توجہ سے محروم رہے ہیں۔پروفیسر حسن عسکری کاظمی بھی ایسی ہی قد آور ادبی شخصیات میں شامل ہیں۔وہ دورِ حاضر کے ان اہل قلم میں شامل ہیں جن کے ذکر کے بغیر کوئی ادبی تاریخ مکمل خیال نہیں کی جاسکتی یہاں کاظمی صاحب کی گراں قدر تصانیف کا تذکرہ بے محل نہیں ہوگا۔

ان کی نو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۱)	دشتِ بے صدا (غزل)	(۲)	خیمہ خیال (غزل ونظم)
(۳)	سرورِ کائنات (نعت)	(۴)	مقصودِ کائنات (مناقب وسلام)
(۵)	کنارِ دجلہ الفت (مرثیے)	(۶)	حرفِ ہنر (مضامین)
(۷)	ریزہ خواب (غزل ونظم)	(۸)	سفرنامہ شام (سفرنامہ)
(۹)	لہو بولتا ہے (نظمیں)		

اس صورتحال میں ہمیں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ممنونِ احسان ہونا چاہئے کہ انہوں نے عہدِ حاضر کے ایک اہم شاعر ادیب، نقاد، محقق اور کالم نگار کے فکر وفن کو ایک کتاب کی شکل میں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے ''حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں'' کے نام سے یہ کتاب حال

ہی میں شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب کے 9 ابواب ہیں جنہیں شبیہ الحسن نے دریچوں کا نام دیا ہے۔ پہلا دریچہ کاظمی کے سوانحی کوائف اور اعترافات دوسرا دریچہ کاظمی کی غزل گوئی کے محاسن، تیسرا دریچہ کاظمی کی ہمہ جہت نظمیں، چوتھا دریچہ کاظمی کا نعتیہ رنگ و آہنگ، پانچواں دریچہ کاظمی کی مرثیہ نگاری، چھٹا دریچہ کاظمی کے مناقب وسلام، ساتواں دریچہ کاظمی کی تنقیدی جہتیں، آٹھواں دریچہ کاظمی کا سفر نامہ اور نواں دریچہ کاظمی کا شعری ونثری انتخاب ہے۔

پہلا دریچہ کاظمی کے سوانحی کوائف اور اعترافات پر مشتمل ہے جس میں ان کے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں متعدد دانشوروں اور ناقدین وا کابرین کی قابل قدر آرا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ منظوم خراجِ تحسین میں سید مظفر نقوی، جعفر بلوچ، ہزدوش ترابی، طاہر ناصر علی اور حشمت علی قمبر کی نظمیں شریک ہیں جو انہوں نے کاظمی صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں کہی ہیں۔

دوسرا دریچہ کاظمی کی غزل گوئی کے محاسن ہے۔ کاظمی ایک منفرد لب و لہجے کے غزل گو ہیں۔ ان کی شاعری محض ان کا شوق نہیں بلکہ وہ اپنی ہر شعری تخلیق کے پیچھے باقاعدہ ایک نظریہ کار فرما دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں

شاعری خونِ جگر کا معجزہ ہے کم نظر
تو اسے سمجھا ہے کارِ بے ثمر اتنا بھی کیا

سخن کے بے برگ وبار شجر کو انہوں نے اپنے خون جگر سے یوں سیراب کیا کہ اس میں تازہ افکار کی کونپلیں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ انہوں نے سچی اور کھری باتیں بیان کی ہیں۔ اس لئے ان کے کلام کا اثر دوچند ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حرف حق کہنے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے اور یہی حرفِ حق کہنے کا ہنر غزل میں ان کا مقصد قرار پاتا ہے۔

خوشبو غزل کی میں نے بکھیری تمام عمر
کارِ ہنر مرا تھا جو بیکار کب ہوا؟

کاظمی کا نظریہ فن یہ ہے کہ کسی بھی فن پارے میں تازگی فکر ہو۔ سچائی کی مہک ہو،

خیالات میں ندرت ہو، زبان وبیان پر قدرت ہو اور لفظوں میں کفایت ہو۔ چنانچہ ان کے یہاں یہ سب صفات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔

ان کی غزلوں میں موضوعات کی ایک دنیا آباد ہے اور یہ موضوعاتی تنوع ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہ موضوعات ہیں۔ حسن وعشق اور اس کے متعلقات جن میں ہجر و وصال کی کیفیات یوں بیان کی ہیں کہ کسی جگہ عشق کا وقار اور معیار کم نہیں ہونے دیا۔ ان کے یہاں عشق کا فلسفہ وحدت الوجود بھی ہے اور وحدت الشہود بھی۔ ان کے نزدیک عشق ایک ارفع عمل ہے اور اس میں ہوا وہوس کو دخل نہیں ان کے خیال میں محبوب ایک مقدس ترین ہستی ہے۔ وہ عشق کی کلاسیکی روایت کے پاسدار ہیں۔ اشعار ان کی قلبی واردات ہیں جن میں جذبوں کی سچائی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی غزل میں پاک نفسی ہے ہوس نہیں۔ گویا ان کے عشق میں پاکیزگی اولین شرط ہے۔

ہر ایک رخ سے عبادت ہے دیکھنا جس کو
مری نگاہ میں وہ پیکر جمال بھی ہے

وہ غم و الم کو عشق کا سرمایہ قرار دیتے ہیں

ہمیں تو شہرِ نگاراں میں بے کلی ہی رہی
سکون اگر ہے کہیں غم کی بارگاہ میں ہے

ان کی غزل کے چند منتخب اشعار دیکھئے۔

تو نے خوشبو کی طرح زادِ سفر باندھ لیا
صحن گلشن میں ہے افسردہ صبا تیرے بعد
اسے تو بھول گیا قربتوں کا دور مگر
مجھے تو یاد اسے صبح شام کرنا ہے
سچ یہ ہے خواہش مہتاب نہ تھی پہلی سی
رخِ محبوب پہ وہ آب نہ تھی پہلی سی

معاشرتی رویوں کی بھرپور عکاسی وہ یوں کرتے ہیں۔

میں دل گرفتہ شہر میں پھرتا ہوں در بدر
جس پر نظر پڑی وہ پریشاں دکھائی دے
چہروں پہ اداسی کی نمایاں ہوئی تحریر
وہ دکھ ہے کہ اک شخص بھی ہنستا نہیں ملتا
بدل دیا غم دوراں نے زندگی کا چلن
کہاں نصیب وہ راحت جو تیری چاہ میں ہے
علاجِ گردشِ دوراں نشاطِ سوزِ دوں
خیال و خواب کا موسم وہی جو پہلے تھا
جینا تو اس زمانے میں آساں نہیں مگر
ہم سخت جاں تھے اس لئے شاید نہ مر سکے

واقعہ کربلا کا عکس بھی ان کی غزل میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

بدن کی مشعلیں جلتی رہیں سرِ مقتل
ہزار سازشیں ہوتی رہیں بجھانے کی
مری وفا کا اسے بھی یقین تھا لیکن
بجھا کے شمع مجھے پھر سے آزمانا تھا
تشنہ لبی وہی ہے سرِ ساحل فرات
اب خیمہ زن ہو کون یہ کس کی مجال ہے؟
ملی ہے مجھ کو حسن جرم آگہی کی سزا
سناں کی نوک پہ رکھا گیا ہے سر میرا
فطرت سے محبت کا یہ انداز دیکھئے
پیڑوں سے طائروں نے کیا کوچ خوف سے
گلشن بھی اب تو مجھ کو بیاباں دکھائی دے

وطن سے محبت ایمان کا جز وہوتی ہے ان کی غزل اس سے بھی آراستہ ہے۔مثلاً

ہمیں یہی ہے شکایت کہ اے زمینِ چمن
ہوا نہ کوئی بھی چاہت میں تیرے سودائی

وہی ہے دشمنِ ایماں وہی عدوئے وطن
کہ جس قبیلے سے آوازۂ فساد آئے

ان کے یہاں طنز ومزاح کا بھی ہلکا سا عکس نظر آتا ہے۔مثلاً

واعظ کے رخ پہ غازہ ہوس کا ہے کیا کہیں
حیران آئینہ ہے یہ آثار دیکھ کر
دن میں جو ناصح مجھے درسِ شرافت دے گیا
رات وہ زہرہ جبیں کی نقرئی بانہوں میں تھا

ان کے یہاں کلاسیکی رجحان کے باوجود ایک جدت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں انفرادیت ہے۔مثلاً

شاید وہ میں تھا یا کوئی مجھ سا تھا سامنے
میں نے تو آنکھ بھر کے نہ دیکھا تھا سامنے

کوئی تو خیمہ اُمید آ کے نصب کرے
پڑی ہیں ڈھیریاں الجھی ہوئی طنابوں کی
وہ کم سخن کہ جسے خامشی پسند آئی
وہ چپ ہوا بھی تو کرتی رہیں خطاب آنکھیں

اونگھتی سڑکوں پہ بے حس قہقہوں کا سلسلہ
میرے افسردہ خیالوں کا تبسم سا لگا

میں چپ رہا تو وہ گمنام تھا زمانے میں
زمانے بھر میں وہ رسوا مرے بیاں سے ہوا

مرے کچھ خواب تھے اس چشمِ تر میں
مگر اڑنے لگی اب خاک گھر میں

حقیقت یہ ہے کہ کاظمی ایک صاحب طرز اور اسلوب ساز شاعر ہیں۔

تیسرا دریچہ کاظمی کی ہمہ جہت نظمیں ہے۔ خیمہ خیال۔ ریزہ خواب۔ مقصودِ کائنات، سرور کائنات اور لہو بولتا ہے میں ان کی مختلف نظمیں شامل ہیں۔ ان میں شخصی نظمیں بھی ہیں اور ان میں محض روائتی توصیف ہی نہیں بلکہ ایک متحرک پیغام بھی پوشیدہ ہے۔

اس کے علاوہ کچھ نظمیں معاشرتی ہیں۔ مثلاً "منظر نامہ"۔ "جالوں کا سفر"۔ "حرف دعا" وغیرہ۔ ان نظموں میں انہوں نے معاشرے کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو امید ہمت اور رجائیت کا پیغام دیا ہے۔

رومانی نظموں میں "دشتِ بے خواب"۔ "اکیلے رہ کے جینا ہے"۔ "انتظار" اور "اداس لمحوں کے غم کدے میں"۔ حسن و عشق کے موضوع پر ہیں۔ ان میں حسن و عشق کے روائتی پہلوؤں کے دوش بدوش فکری موضوعات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ ان نظموں میں عاشق کے یہاں عاجزی تو ہے لیکن ایک وقار اور تمکنت کے ساتھ وطنی نظموں میں وہ حب وطن سے پوری طرح سرشار ہیں۔ مثلاً "پرچم"۔ "حرف عقیدت" جان بھی مجھ پر فدا۔ میرا وطن ہے جاوداں، روشنی کے کنول اور ستاروں پر کمند وغیرہ۔

دینی نظموں میں "عریضہ بحضور آقائے نامدار"۔ "کربلا"۔ "سراپا خیرِ عمل"۔ "سقائے حرم" اور "رہبر کامل"۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ محمدؐ و آل محمدؐ سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں اس کی دلیل ان کی نعت کے علاوہ مناقب و سلام ہیں۔ یہ سب ان کی دینی حیات کی ترجمان ہیں۔

کاظمی کی نظموں کا اسلوب متنوع ہے۔ کہیں سادہ کہیں گمبھیر۔ اکثر نظموں پر فیض کا رنگ غالب ہے۔ ان کی نظموں کا اسلوب جہاں ایک طرف کلاسیکی شعرا کی یاد دلاتا ہے وہاں دوسری طرف مصطفیٰ زیدی کے انداز کی ان میں جھلک ملتی ہے۔ بقول وحید الحسن ہاشمی ان کی نظمیں خیالات کی بلندی اور احساس کا تنوع رکھتی ہیں۔ یوں کاظمی نے صنفِ نظم کو اپنی جدتِ طبع کا محور بنا دیا ہے اور اس کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔

اگلا دریچہ کاظمی کا نعتیہ رنگ و آہنگ ہے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "سرور کائناتؐ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور اس کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہے کہ ان کی نعتوں کا سب سے بڑا وصف ان کا خلوص ہے۔ مثلاً

خوش نصیبی ہے مدینے میں ہے جس کا مسکن
ایسا لگتا ہے کہ ہے باغ جناں شہر نبیؐ

اتری ہے دل میں گنبد خضرا کی روشنی
جیسے شعاع مہر ہو چشم حباب میں

ان کی نعتوں میں اوصاف رسولؐ کے ساتھ ساتھ معجزات نبویؐ کا بھی ذکر ہے۔ عاجزی اور سرشاری ان نعتوں کی خصوصیت ہے۔ نعت کہتے ہوئے وہ اپنی بے بسی اور بے کسی کا اظہار کرتے ہیں۔

خیالِ نعت نگاری میں سرنگوں ہے قلم
مثالِ قطرہ شبنم ہیں اشک آنکھوں میں

انہوں نے حالی اور اقبال کی طرح نعت کو استغاثہ بنانے کی شعوری کاوش بھی کی ہے۔

بے یقینی میں گھرے ہیں مرے آقا کب سے
جبر کی زرد فصیلوں سے رہائی مل جائے

آقا نہیں ہے کوئی مددگار کیا کریں؟
فریاد ہے کہ ہم ہوئے ناچار کیا کریں؟

پانچواں دریچہ کاظمی کی مرثیہ نگاری ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر پانچ مرثیے تخلیق کئے ہیں جو"کنارِ وجلہ الفت" کے نام سے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ان میں"سقائے حرم" حضرت عباسؑ،وقارِ سجدہ،سید الساجدینؑ،عرفانِ شیر خوار حضرت علی اصغرؑ،توقیرِ حریت حضرت حرؑ کے حال میں اور ایک مرثیہ حضرت ابوذر غفاری کے بارے میں ہے۔یہ سب مرثیے جدید طرز کے مرثیے ہیں۔جو مختصر بھی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں جدید اردو مرثیے کو فروغ دینے والوں میں حسن عسکری کاظمی صاحب کا نام بھی آتا ہے۔ان کے مرثیے موضوعات کے اعتبار سے اگرچہ کلاسیکی اہمیت کے حامل ہیں لیکن انہوں نے پرانے موضوعات کو نئے انداز میں بیان کرنے کی کاوش کی ہے۔یوں یہ مرثیے جدت اور کلاسیکیت کا حسین امتزاج نظر آتے ہیں۔ان مرثیوں میں رثائیت کی فضا بہرحال برقرار رہتی ہے جو مرثیے کا بنیادی وصف ہے۔اس کے علاوہ ان مرثیوں کا اسلوب زادہ تر سادہ ہے لیکن کبھی کبھی وہ مرصع زبان بھی استعمال کرتے ہیں۔

چھٹا دریچہ"کاظمی کے مناقب وسلام" ہے۔ان کے مناقب وسلام کا مجموعہ"مقصودِ کائنات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ کاظمی صاحب خانوادہ رسالت سے بے پناہ مودت رکھتے ہیں جس کا اظہار وہ مختلف مناقب اور سلاموں میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً

خالق کا پنجتن پہ کرم بے حساب ہے
ہر فردِ اہلِ بیت نبیؐ لا جواب ہے

ساقیِ روزِ ازل کے چودہ پیمانوں کی خیر
دوسرا ایسا کوئی دنیا میں میخانہ نہیں

کاظمی کے مناقب وسلام میں عصری حسیت نمایاں ہے۔

اسلام پھر ہے نرغۂ اعدا میں ان دنوں
پیش آ رہی ہے آج ضرورت حسینؑ کی

ہر ایک غم کا مداوا ہے ذکرِ کرب و بلا
جہانِ درد میں تازہ الم حسینؑ کا ہے

یہ کربلا کا اشارہ ہے اہلِ حق کے لئے
جہاں میں روبرو باطل کے سر نہ خم کرنا

وقارِ صبر، بہارِ یقیں، شعورِ عمل
حسینؑ آپ نے کیا کیا دیا زمانے کو

گویا کاظمی نے اپنے مناقب وسلام میں سیرتِ اہلِ بیت عظام کے مختلف گوشوں اور منفرد رخوں پر روشنی ڈالی ہے۔

اگلا دریچہ ہے"کاظمی کی تنقیدی جہتیں" جس میں ان کے مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔"حرفِ ہنر" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔جس کے پہلے حصے میں مختلف علمی وادبی شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔مثلاً حسن رضوی، ریاض بٹالوی، سرور مجاز، ضمیر جعفری، اشفاق احمد، عارف عبدالمتین، محسن نقوی، احمد ندیم قاسمی، سیف زلفی اور حفیظ تائب کے علاوہ وحید الحسن ہاشمی۔ان میں سفیرِ ادب حسن رضوی، محسن نقوی سے پل بھر دوستی، سیف زلفی روشنی فکر کا استعارہ اور وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ بارگاہِ امامت کا مدح

خواں غالب خاص مضمون ہے ۔جوان کی تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔

اس دریچے کے دوسرے حصے میں کچھ ادبی جائزے اور مسائل کا تذکرہ ہے ۔تیسرے حصے میں عملی تنقید کے چند نمونے اور کتابوں پر تبصرے ہیں اور چوتھے حصے میں کچھ ادبی تقریبات کا احوال بیان کیا گیا ہے ۔یوں کاظمی کی تخلیق "حرفِ ہنر" ایک طرح سے ادب وصحافت کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے یعنی اس میں تنقیدی مضامین بھی ہیں اور ادبی کالم بھی ۔ان تحریروں کو پڑھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ ایک کومیٹڈ نقاد ہیں ۔ان کے یہاں نہ تو کوئی فکری تضاد ہے اور نہ کوئی تکرار۔

آٹھواں دریچہ سفرنامہ شام کے سلسلے میں ہے ۔یہ سفرنامہ "دیارِ زینبؑ کاظمی صاحب کا اولین سفرنامہ ہے ۔وہ ایک صاحبِ اسلوب تخلیق کار ہیں ۔ان کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے اور زبان پر انہیں قدرت حاصل ہے ۔منظر کشی کے وہ ماہر ہیں ۔چنانچہ اس سفرنامے میں انہوں نے بہترین مرقعے پیش کئے ہیں ۔یہ سفرنامہ ایک طرف ان کے روحانی ارتقاع کا مظہر ہے ۔تو دوسری طرف یہ قارئین کے لئے بیش بہا معلومات کا خزانہ بھی ہے ۔

نواں دریچہ کاظمی کا شعری ونثری انتخاب کے نام سے ہے ۔جس میں حسن عسکری کاظمی کی حمد، نعت، مناقب سلام، مرثیہ اور غزل ونظم میں سے منتخب کلام دیا گیا ہے ۔اسی طرح ان کی نثر کا بھی ایک نمائندہ انتخاب اس میں شامل ہے ۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر شبیہ الحسن کا دوسروں پر کتابیں لکھنا قابل تحسین ہے ۔ان کی جوہر شناسی نے کاظمی کو دریافت کیا ۔انہوں نے کاظمی کے فکر وفن کا تجزیاتی مطالعہ کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو خراجِ عقیدت ہی پیش نہیں کیا ۔ بلکہ ایک غیر جانبدار نقاد کی طرح ان کی شخصیت اور تخلیقات کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت سے اجاگر بھی کیا ہے ۔304 صفحات پر مشتمل یہ گراں قدر کتاب ہر لحاظ سے دلکش اور دیدہ زیب ہے ۔اس کی تصنیف سے جہاں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے عہدِ حاضر کے نقادوں کی جانب سے ایک طرح سے ایک فرض کفایہ ادا کیا ہے ۔وہاں کاظمی صاحب بھی خوش نصیب اہل قلم ہیں جنہیں ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسا زیرک اور ذہین نقاد میسر آیا ۔جس نے کاظمی صاحب کے شایانِ شان ان کی شخصیت اور فن کے مطالعے اور تجزیئے کا حق ادا کر دیا ہے ۔بہر حال یہ وقیع اور جامع تصنیف ڈاکٹر شبیہ الحسن کے شاندار علمی وادبی کارناموں میں ایک خوبصورت اضافہ شمار ہوگی ۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تحقیقی وتنقیدی سفر

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تعلق ایک علمی وادبی خانوادے سے ہے ۔ان کے والدِ گرامی شاعرِ اہل بیتؑ سید وحید الحسن ہاشمی کسی تعارت کے محتاج نہیں ۔عصرِ حاضر کے رثائی ادب میں موصوف ایک ممتاز ومنفرد مقام پر فائز ہیں اور متعدد تصانیف کے خالق ۔خود ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی کثیر التصانیف ہیں ۔گزشتہ دس برس کے قلیل عرصے میں ان کی تقریباً پچیس کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں ۔جس سے ان کی قلم کی جولانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔مسلسل محنت وریاضت کے طفیل تحقیق اور تنقید کے میدان میں انہوں نے عہد موجود کے اکثر ناقدین فن سے اپنی اصابت رائے اور صلابت فکر کا لوہا منوایا ہے ۔چنانچہ مختلف ادبی حلقوں نے ان کی کھلے دل سے پذیرائی کی ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ عصری تنقید اب ان کے حوالے کے بغیر نامکمل نظر آتی ہے ۔

ڈاکٹر صاحب ایک تازہ فکر محقق ونقاد ہیں اور خیال وفن کی پختگی کے اعتبار سے ایک وقیع مقام کے حامل ہیں ۔یوں تو تنقید کے مختلف دبستانوں سے انہوں نے استفادہ کیا ہے مگر تہذیبی تنقید ان کا وصفِ خاص ہے ۔کہ اپنی اکثر تحریروں میں انہوں نے تہذیب کے مختلف رویوں کو اجاگر کرنے کی سعی بلیغ کی ہے ۔وہ ایک باشعور نقاد ہیں اور ان کی تنقید میں ہمیں فکر وشعور کی بازیافت ملتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عصری تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے ان کے تفکر وتدبر میں ایک منطقی انداز ہے اور سماجی رویوں کی بھرپور ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں ہمیں عصری حسیت کے مظاہر عام ملتے ہیں ۔اس کے علاوہ ان کی تحقیق وتنقید میں نفسیاتی عوامل کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے ۔کہیں کہیں ان کے یہاں تاثراتی تنقید کی کیفیت بھی ملتی ہے ۔ان خصائص کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی تنقید میں جہاں وسعتِ نظر دکھائی دیتی ہے ۔وہاں ایک گہرائی اور گیرائی کے عناصر بھی ملتے ہیں ۔مختصراً ان کے تنقیدی اُسلوب کو ہم جدید رویوں کا آئینہ دار سمجھتے ہوئے انہیں ایک ایسا جدید نقاد کہہ سکتے ہیں ۔جس کے فن میں روایت کا مکمل احترام

بھی ہے اور لحہ حاضر کا ادراک وشعور بھی ۔

ان کے تحقیقی وتنقیدی سفر کے ارتقاء کو اگر نہایت اختصار سے بھی بیان کیا جائے تو اس کا خاکہ کچھ یوں ہوگا۔

۱۹۸۷ء میں "بجھی وہ شمع" کے نام سے شاعرِ آلِ محمدؐ حضرت نسیم امروہوی کی یاد میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں ممتاز ومنفرد مرثیہ نگار نسیم امروہوی مرحوم کی حیات اور ان کے فن کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۸۸ء میں "آیات آمنہؑ" کے عنوان سے پیغمبر اسلام جناب رسالتمآبؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؑ کا مرثیہ شائع ہوا۔ جس کے مصنف شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی مرحوم ہیں اور جسے ڈاکٹر صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس تصنیف کے پہلے حصے میں اردو مرثیہ کی اہمیت اور جدید اردو مرثیے میں قیصر بارہوی کی مرثیہ گوئی کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں حضرت آمنہؑ کی شخصیت پر قیصر مرحوم کے مرثیے کا متن ہے اور آخر میں اس مرثیے کے بارے میں متعدد ناقدین کی بیش قیمت آراء مضامین کی صورت میں ہیں۔

۱۹۸۸ء ہی میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ایک اور کتاب 'بیسویں صدی کا شعری ادب' منظرِ عام پر آئی۔ جس میں آٹھ نمائندہ شعراء حسرت موہانی۔ اصغر گونڈوی، ناصر کاظمی، ن۔م۔راشد۔ مجید امجد۔ مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی شامل ہیں۔ اس کتاب میں جہاں ان شعرا کی پانچ پانچ منتخب منظومات شریک ہیں۔ وہاں ان کے فن پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت وقیع اور جامع انداز میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں "آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی" شائع ہوا۔ اس کتاب میں معروف وممتاز شاعر سید آلِ رضا کی غزل گوئی پر ڈاکٹر صاحب نے اردو شعری روایت میں آلِ رضا کا مقام متعین کرنے کی سعیِ جمیل کی ہے۔ اس لحاظ سے غالباً یہ پہلا کام ہے جو آلِ رضا کی غزل پر کیا گیا ہے۔

۱۹۸۹ء میں "العطش" جلد اول شائع ہوئی۔ جس میں سید وحید الحسن ہاشمی کے گیارہ مرثیوں کی

تدوین کی گئی ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے سید وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری کے فنی وفکری محاسن کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ۱۹۸۹ء ہی میں "مفاہیم" کے نام سے ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ شائع ہوا۔ جس میں سات مضامین شامل ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے کام کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ترتیب کچھ یوں ہے۔ طنز ومزاح۔ مقاصد ومحرکات۔ ایک معتبر مزاح نگار فرحت اللہ بیگ۔ اُردو مرثیہ۔ ایک تمہید۔ مرثیے اور قصیدے کی جہتوں کا جائزہ۔ مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں، ظفر علی خاں کی نعت نگاری اور حفیظ جالندھری ایک منفرد گیت کار ۱۹۹۱ء میں قیصر بارہوی مرحوم کے دس مرثیوں کا مجموعہ منتخب مرثیے کے نام سے شائع ہوا جن کی ترتیب وتدوین ڈاکٹر صاحب نے کی ہے اس کتاب میں قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات اور ان کی فنی پختگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں "العطش" کی جلد دوم شائع ہوئی۔ جو سید وحید الحسن ہاشمی کے گیارہ جدید مرثیوں پر مشتمل ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ان کی تدوین کی ہے۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں "حرفِ مدعا" کے عنوان سے وحید الحسن ہاشمی کے معروضات ہیں اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر مظفر عباس کے مضامین ہیں۔

۱۹۹۸ء میں "شام وسحر کی باتیں" شائع ہوئی جو ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ تک ماہنامہ "شام وسحر" کے اداریوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب "شام وسحر" کے مدیر ہیں اور ان کے لکھے ہوئے ان اداریوں پر مختلف تجزیہ نگاروں کی آرا اس کتاب میں شامل ہیں۔ آخر میں ایک توضیحی اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی وقعت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

۱۹۹۸ء میں "کلیات حبیب" کے نام سے حبیب جونپوری کی کلیات شائع ہوئی جس کی تدوین بھی ڈاکٹر صاحب نے کی ہے اور کلامِ حبیب پر ایک بھرپور مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ حبیب کی شخصیت پر مختلف نقادوں کے پانچ مقالے ہیں۔ آخر میں حبیب کا کلام شامل ہے۔

۱۹۹۸ء میں "ترجیحات" کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ جس میں سات شعراء وادبا پر مضامین کچھ اس طرح ہیں۔ محمود نظامی کے سفرنامے کے

بارے میں ۔آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین ۔مولانا مرتضیٰ حسین فاضل ۔ایک مطالعہ ۔نسیم امروہوی ایک موضوعاتی مطالعہ ۔شیر افضل کی شعری تخلیقات،قیصر اقلیم مرثیہ ۔قیصر بارہوی اور ایک معتبر مرثیہ نگار ۔سید وحید الحسن ہاشمی حقیقت یہ ہے کہ اس تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کیا ہے ۔۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب نے ''آغا صاحب'' کے نام سے معروف نقاد ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات وفن پر ایک قابلِ قدر کتاب مرتب کر کے شائع ۔جس میں آغا صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں ان کے علاوہ مختلف اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔

۱۹۹۸ء میں معتبر مرثیے شائع ہوئی ۔اس کتاب میں قیصر بارہوی مرحوم کے گیارہ مرثیوں کی تدوین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔

۱۹۹۸ء میں العطش جلد سوم شائع ہوئی ۔جس میں سید وحید الحسن ہاشمی کے آٹھ مرثیے شامل ہیں ۔ڈاکٹر صاحب نے جہاں ان مرثیوں کی تدوین کی وہاں ان پر ایک طویل اور جامع مقدمہ بھی لکھا ہے ۔۲۰۰۰ء میں باقیاتِ آلِ رضا کے نام سے آلِ رضا مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام شائع ہوا ۔اس کتاب میں تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جہاں آلِ رضا کے غیر مدون کلام کی تدوین صنف وار کی ہے ۔وہاں اس موضوع پر ایک جامع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے ۔

۲۰۰۰ء میں ''جدید لہجے کا شاعر،سیف زلفی'' منظرِ عام پر آئی ۔جس میں سیف زلفی مرحوم کی شخصیت وفن پر مختلف ادباء کی تحریریں اور سیف مرحوم کا منتخب کلام شامل ہے ۔ڈاکٹر صاحب کے مفصل مقدمے نے کتاب کی وقعت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے ۔

۲۰۰۴ء میں اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار شائع ہوئی ۔جس میں نظری اور عملی تنقید پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کے آٹھ مضامین شریک ہیں ۔ان مضامین سے ان کے تنقیدی شعور وادراک کا اندازہ ہوتا ہے ۔۲۰۰۵ء میں مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی منظرِ عام پر آئی ۔جس میں وحید الحسن ہاشمی صاحب کے چالیس مرثیوں کے حوالے سے ان کا مفصل تجزیہ پیش کیا گیا ہے ۔

۲۰۰۵ء میں ''تصریحات'' شائع ہوئی جو ڈاکٹر صاحب کے پندرہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا

چوتھا مجموعہ ہے ۔مضامین کے عنوان کچھ یوں ہیں ۔آغا سہیل کی ادبی جہتیں ۔ادب کا مسیحا ۔طاہر تونسوی ایک مانوس اجنبی اشفاق حسین،نسیم سید کی مکمل گواہی ۔ڈاکٹر طارق عزیز اور خواب آگہی، کچھ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کے بارے میں ۔اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ سید وصی الحسن نقاش کی شاعری ڈاکٹر محمد صالح طاہر کے مضامین ۔شکیل جاذب کی شعری کھنک بے حس معاشرے میں آفتاب کاوش کا تحفہ احساس،جاوید صدیقی بھٹی کا شعری سفر نامہ،ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر، ضیاء الرحمٰن فاروقی،تلوار اور قلم کی حرمت کا امین،خالد محمود امر اور فطرت شناس شاعر اختر حسین سندھو،اس کتاب میں انہوں نے معروف ادباء کے ساتھ ساتھ نئے شعرا وادباء کو بھی اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے ۔جو نئی نسل کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کی دلیل ہے ۔نئے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ یہ تعمیری اور مثبت رویہ ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے ۔

۲۰۰۵ء ہی میں ''العطش'' کے نام سے سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی کلیات شائع ہوئی ۔جس میں وحید صاحب کے چالیس جدید مختصر مرثیے شامل ہیں ۔ان مرثیوں کی تدوین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے ۔جس میں ایک سو سے زیادہ حواشی بھی ہیں ۔

۲۰۰۶ء میں ''سید وحید الحسن کی شعری جہتیں'' منظرِ عام پر آئی ۔جس میں نعت،منقبت اور سلام کے حوالے سے وحید الحسن ہاشمی صاحب کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے ۔یہ ایک تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے ۔جس میں صنف وار وحید الحسن صاحب کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔آخر میں وحید الحسن ہاشمی صاحب کے منتخب کلام کی شمولیت نے کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھا دی ہے ۔

۲۰۰۶ء میں ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر صاحب نے عصرِ حاضر کے ایک ممتاز نوجوان شاعر اسلم کولسری کی شخصیت وفن کا بھرپور جائزہ لیا ہے ۔

۲۰۰۶ء میں ''طاہرین'' شائع ہوئی ۔جس میں وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں ،مناقب اور سلاموں کی تدوین کے ساتھ ساتھ ان کا فنی وفکری مطالعہ کیا گیا ہے ۔یہ مطالعہ ڈاکٹر صاحب کے ایک طویل مقدمے کی صورت میں ہے ۔

۲۰۰۶ء میں ''سیف زلفی کے مرثیے'' کے نام سے منظرِ عام پر آنے والی کتاب میں سیف مرحوم کے چار مرثیے شامل ہیں ۔ڈاکٹر صاحب نے ایک بسیط مقدمے میں ان مرثیوں کا تجزیہ کیا ہے ۔

۲۰۰۶ء میں ''قیصر اقلیم مرثیہ'' شائع ہوئی ۔جو شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی مرحوم کی مرثیہ

نگاری سے متعلق ہے۔اس کتاب میں قیصر کی حیات کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ممتاز ناقدین کی آرا قیصر کے فن کے بارے میں شامل ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے قیصر مرحوم کے تین مرثیوں کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے اور جدید مرثیے میں قیصر کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔

۲۰۰۸ء میں ''ترغیبات'' کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا جس میں تیرہ مضامین شامل ہیں۔جن کے عنوانات کچھ یوں ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں جگ بیتی، ایک باطنی خاکہ نگار ڈاکٹر معراج نیر، اسلام اور پاکستان کا شیدائی حمید کوثر، ع۔س مسلم کے تنقیدی سفر کے ثمرات۔پاکستانی ادب کے قافلہ سالار خالد اقبال یاسر۔پروفیسر جعفر بلوچ ایک صاحب طرز تخلیق کار، عرفانہ عزیز کی شعری کائنات وجاہت حسین کے بارے میں چند معروضات، گلستان ادب کا جمال ڈاکٹر قاسم جلال، ایک سنجیدہ فکر نقاد ڈاکٹر عبدالکریم خالد جمیل احمد عدیل کی افسانہ نگاری کی منفرد جہتیں، ایک حساس تخلیق کار فرقان احمد قریشی اور میلسی کا روشن آفتاب شفیق الرحمٰن الہ آبادی ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں دورِ حاضر کی متنوع ادبی شخصیات کے فکر و فن کو موضوع قلم بنایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ بالا مرتبات و مؤلفات اور تصانیف کے موضوعات سے یہ امر واضح ہے کہ نظری اور علمی لحاظ سے جہاں ان کی تنقید میں ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔وہاں اصناف ادب کے حوالے سے بھی ان کے یہاں تنوع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ معروف و ممتاز اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ وہ نسبتاً کم معروف بلکہ نئے اور نوجوان لکھنے والوں کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بناتے ہیں۔جو ان کا امتیاز ہے۔اُن کا تحقیقی و تنقیدی سفر جس مرحلہ شوق سے شروع ہوا تھا۔وہ اُسی جوش اور روانی کے ساتھ مسلسل اب بھی جاری ہے۔ان کے قلم میں روزِ اول کی سی تازگی اور توانائی موجود ہے۔بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔دعا ہے کہ منزل بہ منزل ارتقاء کا یہ سفر اسی طرح جاری و ساری رہے۔اور

ع اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اقبال ارشد کا سرمایہ حیات

اقبال ارشد میرا بہترین دوست ہی نہیں میرا ہمزاد بھی ہے۔اس کی اور میری شاعری کا آغاز ایک ساتھ ہوا۔اب سے کوئی چالیس برس پہلے مشقِ سخن کے اس طویل تجربے کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو شاعر کہلانے کے لئے تیار نہیں۔ورنہ آج تو یہ کیفیت ہے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوتے ہیں۔دو چار غزلیں اِدھر اُدھر سے اکٹھی کیں اور مجموعہ منظرِ عام پر آیا اور پھر اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹی وی ایسے ابلاغ عامہ کے ذرائع کی سہولیات، ایک شاعر راتوں رات شہرت کی بلندیاں چھونے لگتا ہے۔مگر ہوتا کیا ہے جونہی میڈیا کی بیساکھیاں چھنتی ہیں۔شاعر گمنامی کے گہرے غاروں میں جا گرتا ہے اور دو چار سال بعد کوئی اس کا نام تک نہیں جانتا۔اور میرے خیال میں ایک سچے شاعر اور عام تشاعر میں یہی فرق ہے۔آج جو نوجوان شعراء بیس بیس مجموعے چھپوائے پھرتے ہیں وہ ان تشاعروں ہی کی صف میں آتے ہیں۔اقبال کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔وہ ایک پیدائشی اور فطری شاعر ہے۔شعر جس کی رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔اُسے کسی بیساکھی کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔تعلقاتِ عامہ کا آدمی ہوتے ہوئے بھی وہ میڈیا سے بے نیاز ہے۔اور سچ تو یہ ہے کہ کسی قسم کی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر ہی اس کا فن مسلسل ارتقاء کی طرف گامزن ہے اور یہی اس ہجوم میں اس کی الگ پہچان ہے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ وہ میرا ہمزاد ہے۔اس کی تعریف میں نہیں کر سکتا۔بھلا کوئی اپنی بھی تعریف کر سکتا ہے؟ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ اس کی شاعری میرے لئے باعثِ فخر ضرور ہے۔میں خود تو جیسا کیسا شاعر ہوں لیکن اقبال ارشد کے بارے میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہے۔ایک صاحب طرز ادیب ہے۔بات یہاں اس کی شاعری کی ہو رہی ہے۔وہ غزل اور نظم دونوں اصناف پر حاوی ہے۔اس کی غزل میں جدید حسیت کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کا مکمل کرب پنہاں ہے۔اس طرح اس کی نظم میں اس کی غزل کا

بانکپن اور رعنائی پوری طرح شامل ہے۔

بنیادی طور پر اقبال ایک مذہبی آدمی ہے۔ پکا مسلمان اور سچا پاکستانی، یہی وجہ ہے کہ اس کی ایمانی شاعری ہی اس کا اصل جوہر ہے۔ عقیدے اور ایمان کی پختگی اس کے ماحول کی دین ہے۔ اقبال کا تعلق انبالے کے ہاشمی محلے کے ایک ایسے راسخ العقید مسلمان گھرانے سے ہے کہ روحانیت جس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس کے والد شیخ محمد حیات ہاشمی ایک صاحبِ دل اور صاحبِ نظر صوفی تھے۔ انہوں نے اقبال کی تربیت اس ڈھب سے کی کہ عشقِ رسولؐ اور مودتِ اہلبیتؑ اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئے۔ ان دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔

مسلمانوں کے لئے برصغیر میں ایک نئے وطن کے حصول کی جدوجہد اقبال نے اپنے بچپن میں آزادی کے لئے مر مٹنے کا جوجذبہ دیکھا۔ اس کے نقوش اس کے قلب و ذہن کا حصہ بن گئے اور جب اس نے ہوش سنبھالا تو ایک آزاد مملکت میں خود کو سانس لیتا ہوا پایا۔ یوں گویا آزادی کی جو قدر و قیمت وہ جانتا ہے۔ اس کی عمر کے بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ اس لئے میں نے اُسے پکا مسلمان اور سچا پاکستانی کہا ہے۔ ویسے بھی ایک پکے مسلمان اور سچے پاکستانی میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اصل میں ایک ہی ہیں۔

اقبال کی دینی اور ملی شاعری کا ایک مجموعہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر ''فصیل و پرچم'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ موجودہ کتاب اس موضوع پر ان کی دوسری کتاب ہے جس میں دینی، ملی اور ذاتی موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔

آیئے ذرا ان منظومات کے حوالے سے کچھ بات ہو جائے۔

اس کی دینی شاعری حمد، نعت، منقبت، سلام اور قصائد پر مشتمل ہے۔ لیکن ان معنوں میں روائتی نہیں کہ صرف خانہ پری کے لئے قافیہ پیمائی کی جائے بلکہ اس کی ہر مذہبی نظم شعریت اور ادبیت کے اس مقام پر ہے جہاں انفرادیت کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ ہیئت میں گو اس نے زیادہ تجربے نہیں کئے اور بیشتر نظمیں روائتی ہیئت ہی میں ہیں لیکن ان کا نفسِ مضمون اس لحاظ سے بالکل جدید ہے کہ یہ اس کے اپنے خیالات ہیں۔ کہیں سے کوئی چربہ نہیں اتارا گیا۔ اور نہ کسی دوسرے

کے خیال کا عکس ہیں۔ بیشتر اس کی اپنی دلی واردات ہیں۔ اپنے روحانی تجربات ہیں۔ عقیدے کی یہ شاعری دراصل اس کے بزرگوں کا ہی فیضانِ نظر ہے۔ مکتب کی کرامت نہیں۔ کیونکہ اس شاعری میں سرمستی اور سرشاری کی جو کیفیت ہے۔ وہ روحانیت ہی کا اعجاز ہو سکتی ہے۔ فلسفے کا کرشمہ نہیں اس کی دینی شاعری میں قصائد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں اس کا فن اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔ قصیدہ میمیہ۔ جو محسن کاکوروی کے قصیدہ لامیہ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور بجا طور پر ایک اضافہ ہے۔ اس طرح قصیدۂ نونیہ ہے۔ قصیدۂ حسن جو میرے نزدیک ایک شاہکار سے کم نہیں اور یوں دورِ حاضر جو فنی لحاظ سے قصیدے کے شان و شکوہ سے عاری ہے۔ ان قصائد کے سبب ان خزائنِ شعری سے مالا مال نظر آتا ہے۔

عروسیہ ایک بالکل نئی صنفِ سخن ہے۔ جس کے محرک ہمارے دوست سید محمد احمد زیدی ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے اپنی بچی کی شادی کے موقع پر اسلامی اور ایمانی گیت لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ چنانچہ مشاہیر اسلام کی تقریباتِ عروسی کی یاد میں چند ایسی محافل منعقد کی گئیں جہاں ان مقدس ہستیوں کے سہرے یا ان کی شادی پر تہنیتی نظمیں پڑھی گئیں۔ بعد میں ایسی نظموں کو عروسیہ کا نام دے دیا گیا۔ اس کتاب میں اقبال ارشد نے بھی دو عروسیہ نظمیں شامل کی ہیں۔ ایک عروسیہ حضرت امام حسنؑ اور دوسرا حضرت امام حسینؑ سے متعلق ہے۔ دونوں بڑی مرصع نظمیں ہیں اور جب مذکورہ بالا محافل میں پڑھی گئیں تو حاصلِ نشست قرار دی گئیں۔ خاص طور پر حضرت امام حسنؑ کا عروسیہ اس کا ڈکشن قدرے ہندی آمیز ہے اور یہاں شاعر پر میر جعفر طاہر کے اسلوب کا اثر نمایاں ہے۔ وہی لفظوں کی گھن گرج، مصرعوں کی تلاطم خیز روانی اور شعروں کا ترنم ریز تسلسل منظر نگاری ایسی چابکدستی سے کی گئی ہے کہ زبان و مکان کی سب حدیں ختم ہوتی نظر آتی ہیں۔ بہرحال یہ قصیدہ جدید اُردو قصائد کی تاریخ میں ایک خوب صورت اضافے کے طور پر یادگار رہے گا۔

آفتابِ سحر رہبر عالمِ اسلامی حضرت امام خمینیؒ کی انقلاب آفریں شخصیت کی بارگاہ میں ایک شعری خراجِ عقیدت ہے۔ جسے خلوصِ دل سے تحریر کیا گیا ہے۔

اقبال کی ملی نظموں میں رجزِ ضمیر کی آواز اور غدارانِ وطن سے اس لحاظ سے اہم نظمیں ہیں کہ ان کی

مددسے شاعر وطن پرستی کے تعمیری جذبے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔فلسفۂ حیات، زبان، ایک اور بات، بازگشت، ساعت، تحریر بر فضا، سوچ ماضی حال اور مستقبل اور سال کی آخری نظم اقبال کے خاص آہنگ کی نظمیں ہیں۔ بہاریہ۔ دعائیہ۔ جو اس نے اپنی بچی کی رخصتی کے موقع پر کہیں۔ اور ان نظموں میں شاعر سے زیادہ وہ ایک مشفق باپ کی حیثیت سے اپنے جذباتِ دلی کا اظہار کرتا ہے۔ پھر تین مرثیے ہیں ایک اپنے عزیز دوست جبران کے لئے اور دو اپنے جواں سال بیٹے علی عدنان کی یاد میں۔ علی عدنان جسے وہ پیار سے صرف شان کہا کرتا تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جوانِ رعنا بائیس سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ جب اس کی موت کی خبر میں نے اپنے والدِ مرحوم کو سنائی تو انہوں نے ایک طویل سرد آہ کھینچی اور بروا پشاوری کا یہ مصرع دہرایا۔

بروا سیاں درختاں دی کرے راکھی
میوہ پکے تے کھان نصیب والے

اور پھر وہ اس مصرعے کی بار بار تکرار کرتے رہے۔ تقریباً ایک ہفتے بعد وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لیکن اس مصرعے کی معنویت میرے دل و دماغ میں پیوست کر گئے۔ میرے والد مرحوم بھی پنجابی کے ایک خوش گو شاعر تھے اور اقبال ارشد کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز جانتے تھے۔ پھر بھلا بیٹے کے صدمے کو کیونکر برداشت کرتے۔ چنانچہ چند دن بعد وہ بھی راہئ ملکِ عدم ہوئے۔

شان کے لئے اقبال نے جو نظم کہی ہے۔ وہ ایک ایسا مرثیہ ہے جو ہاری جدید شاعری کی تاریخ میں کم ہی نظر آتا ہے۔ اس نظم میں ہجر کے جاں گسل لمحات اور مجبوری کی خوں چکاں کیفیات کو معجزاتی اُسلوب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شاعر کا دکھ اس کا غم ذاتی سطح سے بلند ہو کر آفاقی دکھائی دیتا ہے۔ اور یہی کسی فن پارے کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بہر حال یہ تمام نظمیں اقبال ارشد کے فکر و فن کا ایک ایسا روشن آئینہ ہیں۔ جس میں ہمیں اس کے شعری سفر کے ہم سنگِ میل میں صاف نظر آتے ہیں۔

سوزِ دروں کا شاعر

ڈاکٹر سردار سوز کا نام اُردو کے ادبی حلقوں میں کوئی اجنبی نہیں۔ وہ ان گنے چنے لوگوں میں شامل ہیں۔ جو امریکہ جیسے دور دراز خطے میں اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان و فن کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ اُردو کی ترقی اور اس کے فروغ و اشاعت میں وہ دن رات مصروفِ عمل ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ خود ایک باکمال نغز گو شاعر کے طور پر معروف و مقبول ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "سوزِ دل" کی علمی و ادبی حلقوں نے دل کھول کر پذیرائی کی اور شائقینِ سخن نے اسے خوب سراہا۔ اب ان کے دو مجموعے بیک وقت منظرِ عام پر آئے ہیں "سوزِ عقیدت" اور "سوزِ دروں"......سوزِ عقیدت ان کی دینی شاعری کا گلدستہ ہے۔ جس میں حمد، نعت، منقبت اور سلام شامل ہیں۔ جبکہ "سوزِ دروں" میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی شریک ہیں۔ "سوزِ دروں" کے پیش لفظ میں ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں۔

"غزل کے سوا مجھے کچھ اور کہنا سننا اچھا نہیں لگتا"۔ گویا غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے اور اس مجموعے میں بھی دیکھا جائے تو غزل ہی غالب ہے۔

ان کی شاعری غزل کی کلاسیکی روایت کی پاسدار ہے اور اس میں وہ تمام حُسن اور رعنائی پوری طرح موجود ہے جو ہماری غزلیہ روایت کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا نظریۂ فن ہے۔

فکر کی تشنگی نہیں بجھتی
شعر میں ہو اگر نہ گہرائی

اور یہ گہرائی ان کے یہاں جذبے کے جمال، احساس کے حُسن اور خیال کی پاکیزگی سے وجود میں آتی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت و بلاغت اور فن کی رعنائی و زیبائی سے آراستہ ان کا کلام اعلیٰ انسانی اقدار کا ترجمان ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں ہم محبت کا عظیم پیغام کہہ سکتے ہیں۔

ہم محبت کا بھی مینار بنا سکتے تھے
ہم کو نفرت کی نہ دیوار گرانی آئی

وہ ہاتھ خود ہی مٹا دے گا دشمنی ساری
جو ہاتھ آپ بڑھائیں گے دوستی کے لئے

قریب آتی نہیں اس کے کبھی نفرت کی تاریکی
محبت کا دیا جس آدمی کے دل میں جلتا ہے

منصب و جاہ نہ زر مانگتے ہیں
اک محبت کی نظر مانگتے ہیں

محبت کے امرت رس میں ڈوبے ہوئے ایسے شیریں اشعار آج کے دور کی نفرت بھری زہر آلود فضا کا نہ صرف مداوا ہیں۔ بلکہ شاعر کے نزدیک اس کی پوری کی پوری شاعری ایک طرح سے محبت ہی کا ایک اظہار ہے۔

ان سے اظہار ہے محبت کا
شاعری سوز اک بہانہ ہے

غزل بھی ہجر و وصال سے پر معاملاتِ محبت ہی کا ایک فنی بیان ہے۔ جسے ہم تغزل سے تعبیر کرتے ہیں اور سوز کی تمام شاعری تغزل ہی کی مستی سے سرشار دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً

اس کا عنوان ترا نام ہی رکھا ہم نے
بھولی بسری جو کوئی یاد کہانی آئی

زخمِ دل جو عطا کیا تم نے
سوز کی زندگی کا حاصل ہے

ہم ہی دنیا میں رہ گئے تنہا
ساتھ ان کے تو اک زمانہ ہے

یہ حسنِ اتفاق ہے پھر مل گئے ہیں وہ
یہ اور بات ہے کہ ہمارے نہیں رہے

میں تو اپنے سے بھی بیگانہ ہوں
کر دو تم میرے حوالے مجھ کو

انہیں دیکھا تھا اک دن مسکرا کے
زمانے بھر میں چرچا ہو گیا ہے

ہم بھی عجیب لوگ تھے کیسے یہ اپنے روگ تھے
صبح کا گیت چھوڑ کر نغمۂ شام لے لیا

نہیں دیکھا وہ سر جھکتے کہیں بھی
جسے نسبت ہے تیرے سنگِ در سے

سوز عرصۂ دراز سے وطن سے دور دیارِ غیر میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس طرح کہ ہر لمحہ وطن اور اہلِ وطن کا خیال انہیں رہتا ہے۔ اور ہجرت کا یہ دکھ بھرا احساس ان کے پورے وجود پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

وطن سے دور مسافر چلے تو جاتے ہیں
وطن کو لوٹ کے آنے میں دیر لگتی ہے

کتاب کا ایک مختصر گوشہ ''نذرِ سیما'' ہے۔جس میں ایک مرحوم محبوب ہستی کی یاد انہیں تڑپائے ہوئے ہے۔ایک نظم ''تم تو سونے بھی اب نہیں دیتے'' کے علاوہ غزل کے اشعار میں بھی یہ احساس جاری وساری ہے۔

اس کی تصویر میرے کمرے میں
یاد اپنی دلا رہی ہے مجھے

بے کسی اُس کی وہ دمِ رخصت
یاد آ کر رُلا رہی ہے مجھے

سوز جانے دو مجھ کو مت روکو
میری سیما بُلا رہی ہے مجھے

نظموں میں ''ناکام محبت''، ''دل کی آواز''، ''سماج''، ''بھولی کہانی''، ''تم نہیں آئے''، ''پھول گرا ہے ان بالوں سے''، ''ہر رات دوالی ہوتیری''، ''بدنصیب مسافر'' اور ''جانِ بہار'' پابند، آزاد ہنڑی نظم اور گیت کی مختلف ہیئتوں میں خوبصورت فن پارے ہیں۔

''نذرِ وطن'' کے عنوان سے کچھ نظموں میں شاعر ایک سچے محبِ وطن کی حیثیت سے وطنِ عزیز کی زبوں حالی پر نوحہ کناں نظر آتا ہے۔

آخر میں قطعات، رباعیات اور ہائیکو کے گوشے سے ان کے کمالِ فن کا ایک ایک تخلیقی نمونہ پیش ہے۔

قطعہ

لفظ نفرت کا لغت ہی میں نہیں ہے میری
سارے انسانوں سے میں پیار کیا کرتا ہوں
اپنے دشمن کا بھی بد خواہ نہیں ہوں اے سوز!
اُس کے حق میں بھی بہر حال دعا کرتا ہوں

رباعی

جب رات گئے رات کی رانی مہکی
بُلبل مرے ویرانۂ دل میں چہکی
مجھ پر یہ تیری یاد نے کیا سحر کیا
باتیں کرنے لگا ہوں بہکی بہکی

اور ہائیکو کا ایک نمونہ

بارش کا قطرہ
ٹہنی سے ٹپ ٹپ ٹپکا
میں فوراً چونکا

ان دلکش مثالوں کو دیکھ کر آسانی سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ان اشعار کا خالق ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہے۔جو نہ صرف ایک دلِ دردمند رکھتا ہے۔بلکہ اپنے دل کی تپش کو جسے وہ ''سوزِ دروں'' کا نام دیتا ہے خوبصورت اور پر اثر پیرائے میں بیان بھی کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

جامِ کوثر۔۔۔شرابِ طہُور سے لبریز جام

ڈاکٹر خان محمد ساجد کا مجموعہ حمد ونعت ''جامِ کوثر'' میرے سامنے ہے۔اس سے پیشتر ان کے تین مجموعے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔عام نظم وغزل سے حمد ونعت کی طرف ان کا سفر خوش آئند ہے کہ دنیوی موضوعات پر اظہار وبیان کی کامیابی کے ساتھ ساتھ اب انہیں دینی برکات کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سائنسی اور طبی حلقوں میں ایک ممتاز محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ علم اور تحقیق وتدقیق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہونے کے باوجود ان کی شخصیت اخلاص اور انکسار کا مجسمہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ عام شاعری کی طرح دینی شاعری میں بھی ان کا لب ولہجہ نہایت سادہ اور سلیس ہے۔یعنی وہ اپنے جذبات واحساسات کو سادہ مگر موثر الفاظ کا پیکر عطا کرنے میں کامیاب وکامران ہیں۔''جامِ کوثر'' کی شاعری میں زبان وبیان کا یہی انداز ہے۔

آغاز میں ''حمد'' اگر سورۂ فاتحہ کے مطالب آسان لفظوں میں لئے ہوئے ہے تو مناجات ''اے رب کرم'' کے بعد درود شریف میں بھی اس کا مفہوم سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نعتیں ہیں تو ان میں بھی سادگی اور سلاست کا یہی رنگ ہے۔جن سے ابلاغ وترسیل میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ان کی نعت میں یوں تو تقریباً وہ تمام مضامین اور موضوعات نظر آتے ہیں جو ہمارے دور کی نعت کا خاصہ ہیں۔لیکن ان کے اظہار میں تین رجحانات زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں، یعنی اسوۂ حسنہ، عشقِ نبیؐ اور پیغامِ رسولؐ۔

اسوۂ حسنہ میں حضور نبی کریمؐ کے بیشتر فضائل وخصائل کی خوشبو عام ملتی ہے مثلاً

اُن کی خوشبو بکھیرے چمن در چمن
آسماں سے خدا نے اُتاری ہوا

یہ نامِ محمدؐ کی برکت ہے کہ اندھیروں میں بھی روشنی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

اُن کا لیا جو نام ضیا بار ہو گیا
بے نُور تھا میں صاحبِ اَنوار ہو گیا

انہی کیفیات کو ان شعروں میں دیکھئے۔

جب وہ آیا ماہِ کامل کالی کملی اوڑھ کر
روشنی ایسی ہوئی شام و سحر روشن ہوئے

ہر صحیفے میں ہے تیری روشنی
کون پہنچا ہے تری اس شان تک

چاند تاروں میں ہے جو تابندگی، ہے آپ سے
خلوتوں میں جلوتوں میں روشنی، ہے آپ سے

تہذیب وتمدن ہو کہ قانون امم ہو
''ہر سُو ہیں اُجالے اسی فانون ھدٰی کے''

ہو گئی وہ ماہِ تاباں سارے عالم کے لیے
پڑ گئی جس خاک پر صل علیٰ کی روشنی

فضائل نبویؐ کا رنگ ان شعروں میں بھی جھلکتا ہے۔

مصطفےٰ کے پاؤں چومے جس گلی کی خاک نے
اس گلی کی خاک پر قربان ساری رفعتیں

جس کی خبر دی انبیا نے اپنے اپنے دور میں
مذکور ہے جو بارہا کوئی نہیں تیرے سوا

عشقِ نبی نعت کے اساسی اور مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔اگر یہ نہ ہو تو نعت ایک بے روح جسم کی حیثیت اختیار کر جائے۔ڈاکٹر خان محمد ساجد ایک سچے عاشقِ رسول ہی ہیں جو کہتے ہیں۔

میں تڑپتا ہوں مدینے کی گدائی کے لیے
تو مری سوچوں کا حاصل، قلب کی تسکین تو

اسی موضوع کو وہ مختلف الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

صبحِ ازل، صبحِ ابد، صبحِ جہاں کو کیا کروں
ہو جس میں ذکرِ مصطفےٰ، اس شام سا کوئی نہیں

وہ شہِ دو جہاں کی قربت کو اپنی سب سے بڑی تمنا قرار دیتے ہیں۔

ہو قربت میسر شہِ دو جہاں کی
ازل سے ہے اے ذاتِ باری! تمنا

حضور کی محبت ہی کو سراپا دین قرار دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

وہ دین جو عزیز ہے ربِ کریم کو
وہ دین ہے سراپا محبت حضورؐ کی

اسی رنگ کے یہ چند اشعار دیکھئے۔

ہوں غلامِ مصطفےٰ میری نظر کے سامنے
رفعت افلاک ہے بس ایک زینے کا سفر

اور ہونگے دینے والے اور لوگوں کے لئے
تیرے کوچے کے گدا کا کون ہے تیرے سوا؟

شوکت دہر کو وہ ذہن میں کب رکھتا ہے
جو زمانے میں محمدؐ کی طلب رکھتا ہے

جو اک بار آیا ترے در پہ سائل
وہ جاتا نہیں ہے کہیں پھر دوبارا

مل جائے غلامی مجھے بس شاہ امم کی
شوکت کا یا منصب کا طلب گار نہیں ہوں

مری آنکھ میں سبز گنبد کے جلوے
ہے دریائے الفت رواں میرے دل میں

شہِ مدینہ کہاں میں جاؤں کہ میری سوچوں کی تو ہے منزل
تو ہی مداوا ہے مشکلوں کا ہے تو ہی حل میری الجھنوں کا

نہیں خواہش کوئی جنت کی بس اتنی تمنا ہے
چنوں تیری گلی کے میں خس وخاشاک آنکھوں سے

ساجدؔ ہے برباد اگر تو
دل میں کر آباد مدینہ

مہک اٹھا خزاؤں میں چمن مرے خیال کا
یہ کس طرف نکل گئی ہے میرے دھیان کی روش

تعلق ہے ہمارا اب مدینے کی فضاؤں سے
فرشتے ہم کو دوزخ میں کبھی لے کر نہ جائیں گے

دیا ہے رزق جہاں کو خدا نے تیرے طفیل
ترے بغیر بھلا کون ہے مرا داتا

عصرِ حاضر میں انسانیت جس روحانی کرب کا شکار ہے اس کا علاج اگر ہے تو پیغامِ رسولؐ پر عمل ہے صرف اسی صورت میں انسانیت کا سفینہ ضلالت و گمراہی کے گرداب سے نکل سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسی خیال اور نظریئے کے علمبردار رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنے دیس کو نفرت و تعصب کی آگ میں جلتا ہوا دیکھتے ہیں تو رحمت اللعالمینی کی گھٹا کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔

جل رہا ہے قریہ قریہ دیس کا
رحمتوں کی اے گھٹا گھر آ مرے

زمانے کی مشکلوں کا حل صرف اور صرف انہی کی ذات میں ہے۔

وہ سنتے ہیں ساجدؔ محبت سے اُس کی
کوئی مشکلوں میں انہیں جب پکارے

اور دنیا میں اگر کوئی در ایسا ہے کہ جس پر ادب سے جھکا جائے تو وہ فقط درِ رسولؐ ہے۔

زمانہ سر جھکانے کا اگر مطلب کبھی سمجھا
قدم چومے گا تیرے اے شہِ لولاک آنکھوں سے

ڈاکٹر خان محمد ساجد عشقِ رسولؐ کی وادیٔ پر بہار میں اس مقام پر ہیں کہ جب ان کے ہونٹوں پر نعتِ نبی آتی ہے تو گویا کوثر کا جام چھلک چھلک جاتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

لگاؤ کیسے ہومے سے تجھے بتا ساجدؔ
کہ تیرے لب پہ تو کوثر کا جام چھلکا ہے

یہ جامِ شرابِ طہور سے لبریز وہ جام ہے جس سے تشنگانِ محبت سیراب ہو سکتے ہیں۔

زین صدیقی کی غزل

زین صدیقی کی شخصیت تہذیب، شائستگی اور وضعداری سے عبارت ہے۔ وہ ایک سادہ مگر پُر وقار اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ شرافت خلوص اور دردمندی سے مرکب، ان کی شاعری بھی فطری طور پر ان کی شخصیت ہی کا ایک پرتو ہے۔ میرے خیال میں فنی اور فکری لحاظ سے وہ میر اور حالی کی روایت سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ میر کی سادگی ہماری شاعری میں کلاسیکت کی نمائندہ ہے اور حالی کی دردمندی جدید طرزِ فکر کی علمبردار اور غزل کی شاعری میں یہ سادگی اور درد مندی ہمارے یہاں ایک مستحکم روایت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ زین کے تغزل میں بھی اس روایت کی پاسداری ملتی ہے وہ دل میں اترنے والے دھیمے دھیمے لہجے میں بات کہنے کا فن جانتے ہیں۔ اور پھر زبان کا حُسن اس سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ مثلاً

بے اثر ہر التجا ہونے لگی
ہو گئی ایسی بھلا تقصیر کیا؟

بہت آساں ہے دل کو توڑ دینا
بہت مشکل مگر دل جوڑنا ہے

جاتے ہوئے پلٹ نہ آؤں پھر
بھیگی پلکوں سے یوں نہ رخصت کر

مجھے تیری طلب سے کیا غرض ہے؟
میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

کوئی رہنے لگا ہے دل کے اندر
تعجب، اتنا غافل ہو گیا ہوں

آپ نے دیکھا کہ یہ سارے اشعار چھوٹی بحروں میں ہیں۔ زینؔ کے کلام کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ وہ زیادہ تر مختصر بحروں کو پسند کرتے ہیں کہ یہ بحریں زیادہ پر اثر اور مترنم ہیں۔ اُن کی غزل میں کہیں کہیں گفتگو اور بات چیت کا سا انداز بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً

سلوک ہونے لگا ہم سے پھر نرالا کیوں؟
کوئی غرض کوئی مطلب جناب والا کیوں؟

دوست جب ہو گئے ہیں دشمن تو
دوستی کیا مرے عدو کرتے؟

شکل یہ تھی تو زین صاحب کیوں؟
گھر میں لا کر اک آئینہ رکھا

جب سزا ہی مرا مقدر ہے
فیصلہ کل پہ کیوں اٹھا رکھا

ان اشعار میں مکالمے کا سارا حُسن یعنی بے ساختگی اور بے تکلفی پوری طرح موجود ہے۔
غزل میں نفسیاتی واقعیت کا ادراک و اظہار عصرِ حاضر کی خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں زین کے تغزل کا اسلوب دیکھئے۔

محو جب اپنے احتساب میں تھا
لمحہ لمحہ میں اضطراب میں تھا

بھرم اُس شخص کا رکھنے کی خاطر
ہمیں تو جیت کر بھی ہارنا ہے

جب چاہے اُتر آؤ مرے دل میں بصد شوق
چاہت کی گھڑی کوئی پرانی نہیں ہوتی

جھوٹ کو سچ میں کہہ نہیں سکتا
میں ہوں مجبور اپنی عادت سے

میں اُس کو کتنی محبت سے دیکھتا تھا زین
یہ اور بات کہ اُس کو کوئی لگاؤ نہ تھا

اُن کو بھول جانے کا سوچتا تو ہوں لیکن
اُن کو بھول جانے کا دل کو حوصلہ ہو گا؟

عذابِ ہجر ضروری ہے وصل سے پہلے
اسی لئے میں محبت نہیں کیا کرتا

یہ اشعار تغزل کی اُس روایت کے زیرِ اثر ہیں۔ جس کی طرف میں شروع میں اشارہ کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ زین نے میر اور حالی کے تغزل کے امتزاج سے اپنا ایک اُسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ عہدِ موجود کی ہنگامہ خیز زندگی میں فرد کی تنہائی ایک ایسا آشوب ہے، جو اکثر شعرا کا موضوعِ سخن ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ

باہر تنہائی کا احساس جتنا شدید ہوگا۔باطن میں ردِعمل کے طور پر اُسی قدر ہنگامہ آرائی محسوس ہوگی۔

جب بھی تنہائی کا ہوا احساس
دل میں در آیا کوئی اندر سے

اسی طرح ہجوم میں اکیلا رہنے کی کیفیت بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔

ہجومِ دوستاں کے درمیاں بھی
اکیلا تھا، اکیلا رہ گیا ہوں

منطقی استدلال بھی ہماری آج کی غزل کے اہم عناصر میں شامل ہے۔زین بھی منطق کے اس استعمال کے قائل ہیں۔اس سلسلے میں وہ اکثر سوالیہ انداز اپناتے ہیں۔اور ایسے سوال کرتے ہیں۔جن کا جواب بھی سوال ہی میں پنہاں ہوتا ہے۔مثلاً

چلے ہیں ڈھونڈنے تریاق زہرِ قاتل کا
وہ سانپ تھا تو اُسے آستیں میں پالا کیوں؟

آنکھ نے جب خواب ہی دیکھا نہ ہو
کوئی بتلائے بھلا تعبیر کیا؟

عشق کا نام ہے جنوں تو پھر
خوف کیوں کھا رہے ہو پتھر سے؟

نگاہِ لطف و کرم کی یہ بارشیں کیسی؟
وہ بے سبب تو عنایت نہیں کیا کرتا

یہ منطق پسندی شاعر کو حقیقت کے زیادہ قریب لے آتی ہے اور وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر مختلف سماجی، معاشی اور سیاسی حقائق کو خالص معروضی انداز میں دیکھنے لگتا ہے۔مثلاً صنعتی انقلاب نے گاؤں والوں کے لئے شہروں میں زیادہ کشش پیدا کردی ہے اور آئے دن لوگ گاؤں

کے سادہ اندازِ زندگی کو چھوڑ کر شہر کے پیچدار اور پر تصنع طرزِ حیات کو اپنانے کی کوشش میں ہیں کہ شہر میں معاش کے ذرائع نسبتاً زیادہ ہیں۔اس طرح گاؤں کی آبادی آہستہ آہستہ کم اور شہروں کی آبادی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔جو اپنی جگہ کئی ایک مسائل کو جنم دے رہی ہے۔شاعر اس طرزِ فکر کو غیر فطری سمجھتے ہوئے اس کے خلاف ہے اور مسلسل محنت سے اپنے گاؤں ہی کو رشکِ شہر بنانا چاہتا ہے۔

گاؤں سے شہر کو نہ ہجرت کر
اپنی محنت سے گھر کو جنت کر

اس مشینی دور میں زندگی اس قدر تصنع اور منافقت کا شکار ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص اور محبت کا اظہار بھی کرے تو دیکھنے والوں کو ایک حیرت ہوتی ہے۔

دیکھتا ہوں میں چشمِ حیرت سے
کوئی ملتا ہے جب محبت سے

ایسی ہی حقیقت پسندی ذیل کے ان اشعار میں بھی نظر آئے گی۔

دوست ہو گئے دشمن ایک سچ کے کہنے پر
اس سے بڑھ کے کیا کوئی اور حادثہ ہو گا؟

جاگتے رہنا سفر میں ہے ضروری، ورنہ
آنکھ لگ جائے تو سامان بدل جاتے ہیں

زندگی کے ان حقائق میں بعض اوقات تضاد کی کیفیت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور یہ تضاد تصویر کے دو مختلف اور متصادم پہلوؤں کی طرح ہیں۔جن کو بیک وقت اور بیک مقام دیکھنے سے حقیقت زیادہ واضح اور موثر محسوس ہوتی ہے اور صورتحال کی سنگینی اور زیادہ شدید دکھائی دیتی ہے۔مثلاً

ہوائیں چل رہی ہیں سرد لیکن
ذرا گرمی نہیں آتشکدوں میں

تضاد کے اس احساس کے تحت یہ اشعار بھی دیکھئے۔ہر جگہ ایک بالعکس حقیقت سامنے نظر آتی ہے۔

شجر سے شاخ جدا وہ ہوئی تھی طوفاں میں
ثمر کے بوجھ کا جس پہ کوئی دباؤ نہ تھا

مسکراتا ہوں ظاہراً لیکن
گرچہ ٹوٹا ہوا ہوں اندر سے

زیؔن اُن شاعروں میں شامل ہیں۔ جو وطن سے دور کوبہ کو سفر کی حالت میں ہیں۔

رزق ملتا اگر وطن میں تو
ہم سفر یوں نہ کوبہ کو کرتے

ترکِ وطن کا یہ احساس انہیں پردیس میں اپنے وطن سے اور بھی گہری محبت عطا کرتا ہے۔ اور وہ دور رہ کر بھی وطن کی ہر ابتلا پر بے اختیار تڑپ اٹھتے ہیں۔

وطن کے نام پہ سوداگری جو کرتے ہیں
انہی کے نام کا ہوتا ہے بول بالا کیوں؟

زین جن کا کام ہو نام و نمود
وہ کریں گے ملک کی تعمیر کیا؟

وطن پرستی کا یہ جذبہ اُن کے رگ و پے میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ اور وہ خود بھی خون کی اس گردش کو اپنے اشعار کی روانی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں اور زندگی اور حرارت سے بھرپور یہی ان کا نظریہ فن ہے۔

جذبات نہ ہوں جس میں تو اے زین غزل کیا؟
اشعار تو ہوتے ہیں، روانی نہیں ہوتی

تعجب یہ ہے کہ زین جیسے پختہ مشق شاعر کا اب تک کوئی مجموعۂ کلام منظرِ عام پر کیوں نہیں آیا؟ انہیں جلد اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ ادب کے سنجیدہ قارئین کو اس کا انتظار رہے گا۔

ثاقبہ رحیم الدین کی کہانیاں

لکھنے اور کہنے میں بڑا فرق ہے۔ لکھنا مشکل ہے اور کہنا آسان۔ لکھنے میں تکلف سے کام لینا پڑتا ہے۔ جبکہ کہنے میں بے ساختگی ہے، لکھنے میں پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ پھر لفظوں کو چننا پڑتا ہے اور پھر جملوں کو ترتیب دینا پڑتا ہے، جبکہ کہنے میں خیالات سوچنے نہیں پڑتے۔ لفظ ڈھونڈنے نہیں پڑتے اور نہ جملوں کو ایک خاص ترتیب میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کہنے میں سوچ کا کوئی فعل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کہنے میں سوچ پہلے سے پس منظر کے طور پر موجود رہتی ہے لیکن ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ بیگم ثاقبہ کہانی لکھنے کی بجائے کہانی کہتی زیادہ ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے جو لکھا ہے اس میں کہانیوں کی کثرت ہے۔ اب تک ان کی کہانیوں سات مجموعے آچکے ہیں۔ یعنی صبح کا تارا۔ جاگو جاگو۔ دوستو چلے چلو۔ سورج ڈھلے۔ کرنیں۔ چاند نکلا۔ گلاب اور بادل جھومے۔

بچوں کے لئے ان کی کہانیاں خوبصورت، موثر اور سبق آموز ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جگنوؤں کی طرح چمکتی اور کلیوں کی طرح مہکتی یہ کہانیاں مقصدیت سے پر اور افادیت معمور ہیں۔ کہ ان میں اعلٰی انسانی اقدار محبت، شفقت، فیاضی ایثار، ہمدردی ہمت، استقلال، عزم، عالی ظرفی، حوصلہ مندی، سچائی، انسان دوستی، حب الوطنی، قومی اتحاد و یک جہتی احترام اور خوفِ خدا کی تعلیم و تبلیغ ہے۔ لیکن یہ تعلیم و تبلیغ اس انداز سے ملتی ہے کہ سننے اور پڑھنے والے بچوں کو وہ نصیحت سے زیادہ محبت اور پیار کی باتیں ہی نظر آتی ہیں۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بن کر اس طرح بات کرتی ہیں۔ جس طرح ان کا کوئی دوست اور ساتھی بات کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بچے ان میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ باتیں ان کے دل میں روشنی کی طرح اتر جاتی ہیں۔ بیگم ثاقبہ کی کہانیاں ہماری روایتی کہانیوں کی طرح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ سنی سنائی کم اور آپ بیتی زیادہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ زیادہ دلکش

اورموثر ہیں۔ان کے موضوعات میں وسعت بھی ہےاورتنوع بھی۔اوراس قدر تعداد میں کہانیاں لکھنے کے باوجودان میں کسی موضوع کی تکرار نہ ہونے کے برابر ہے۔پھران کا کینوس اورمحل وقوع بھی نہایت وسیع ہے۔اگر چہ یہ زیادہ تر وطنِ عزیز پاکستان کے خوبصورت جغرافیائی پس منظر سے متعلق ہیں۔لیکن اس کے علاوہ کرہ ارض کے دوسرے خطے خاص طور پر عرب دنیا بھی ان کا موضوع ہے۔

پاکستان کے چاروں صوبوں پنجاب سندھ سرحد بلوچستان کے مختلف خطوں کو انہوں نے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔یہاں کے شہر۔گاؤں۔جنگل۔پہاڑ۔درخت۔سبزہ۔میدان،ندی نالے،دریا،سمندر،جھیلیں وادیاں اورصحراان میں ہمیں اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔

کہیں ہنزہ کے بلند وبالا پہاڑ ہیں تو کہیں کلفٹن کا ساحل سمندر،کہیں سوات اورپھول گراں کے دلکش نظارے ہیں تو کہیں زرغون پہاڑی کا دامن،کہیں کیرتھر پارک ہےتو کہیں چاغی کا پہاڑ۔کہیں جیکب آباد کا چٹیل میدان ہےتو کہیں کھوبہ کی سطح مرتفع،کہیں حنا جھیل ہےتو کہیں دامن کہسار،اس کے علاوہ یہاں کے جانور گائے۔بیل۔بکری،بھیڑ،بلی،کتا،خرگوش،مچھلی،عقاب اور چڑیا مینا طوطا بھی ان کی کہانیوں کی زینت ہیں۔اس طرح وہ بچوں کو جہاں پاکستان کے مختلف رنگا رنگ خطوں کی سیر کراتی ہیں۔وہاں بچوں کوانسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں اورپرندوں سے بھی محبت کا پیغام دیتی ہیں۔

ان کہانیوں میں کہیں کسی جادوگری اورپرستان کی خیالی دنیا ہےتو کہیں حقیقی دنیا کی عکاسی۔کہیں تاریخی اوردینی موضوعات ہیں تو کہیں جدید سائنسی ایجادات سے تعارف ہے۔یہ ساری معلومات بچوں کوحقیقی مسرت اوربصیرت عطا کرتی ہیں اوریوں چپکے چپکےان کی تعلیم وتربیت کا اہم فریضہ ادا کرتی ہیں۔

بیگم ثاقبہ عورت ہونے کے ناطے کہانی کہنے اورسنانے کا ہنر جانتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کہانی کہنے کے انداز میں معصومانہ حیرت بھی ہےاوربے ساختہ پن بھی۔ہماری روایتی دادیاں نانیاں،کہانیوں کو عام طور پر بچوں کے سلانے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔لیکن بیگم ثاقبہ کی

کہانیاں ان سے اس لئے یکسر مختلف ہیں کہ وہ ان کہانیوں سے بچوں کو جگانے کا کام لیتی ہیں کہ انہیں سن کران کی ذہانت ان میں اوربیدار ہو جاتی ہے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیگم ثاقبہ کی کہانیوں کی مجموعی فضا حقیقت پسندانہ اورجدید دنیا سے متعلق ہے۔جہاں تک ان کے اسلوب کا تعلق ہے وہ نہایت سادہ،دلچسپ اوردل نشیں ہے۔اس میں کہانی کی سی سادگی،داستان کی سی دلچسپی اوراد ب کی سی دل نشینی موجود ہے،وہ چپکے چپکے بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ذخیرہ الفاظ میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔ان کے موضوعات میں وسعت اورتنوع ہےاورفن میں تازگی اورنکھار۔

بچوں کے ادیب کی بنیادی صفت یہ ہے کہ جہاں اسے بچوں کی ذہنی سطح کے قریب رہنا چاہیے وہاں اس کی زبان کو بھی بچوں کی سی سادہ زبان ہونا چاہیے۔بیگم ثاقبہ چونکہ اول وآخر بچوں کی ادیب ہیں۔اس لئے ان میں یہ خوبیاں پوری طرح موجود ہیں۔وہ بچوں سے ان کی اپنی زبان میں ان کی دلچسپی کی باتیں کرتی ہیں۔اسی لئے وہ ان میں مقبول ہیں۔

سادگی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان میں ایک چاشنی ہےاوراس میں روزمرہ اورمحاورے کی لطافت اوربے ساختگی عام ملتی ہے۔ان کا اسلوب شگفتہ اور ہلکا پھلکا ہے۔جس سے بچے لطف لیتے ہیں۔یہ انداز کہیں کہیں تو گیتوں کے قریب ہو جاتا ہے۔مثلاً بادل جھومے تو ہوا چلی۔ہوا چلی تو پتنگ اڑی۔بادل جھومے تو چڑیا بولی،چڑیا بولی تو گیت بنا،بادل جھومے تو پھول کھلا۔پھول کھلا تو خوشبو پھیلی۔بادل جھومے تو دھنک ناچی۔دھنک ناچی تو رنگ کھلے۔بادل جھومے تو جھولے پڑے۔جھولے پڑے تو دوست ملے۔

بیگم ثاقبہ کی کہانیوں کا مقصد پاکستانی بچوں میں اسلام اورپاکستان سے سچی محبت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی دوستی کے لازوال جذبے کو اجاگر کرنا بھی ہےاور"صبح کا تارا" سے لے کر "بادل جھومے" تک ساری کی ساری کتابوں میں یہ مقصد خوشبو کی طرح پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے بچوں کے ادب میں بیگم ثاقبہ کا دم غنیمت ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اورزیادہ ہماری دعا ہے کہ بچوں کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ روشن روشن اجلی اجلی کہانیاں لکھتی رہیں۔اورعلم وفن کی روشنی کواسی طرح عام کرتی رہیں۔(آمین)

ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟

انسان کو عموماً حیوان ظریف کہا گیا ہے۔ یہ حس مزاح ہی ہے جو انسان کو عام طور پر تمام حیوانوں سے امتیاز بخشتی ہے۔ قدرت نے انسان یعنی حیوان ظریف یا حیوان ناطق کو ہنسنے مسکرانے کی خاصیت عطا کر کے اسے تمام مخلوقات میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ہنسنا ہنسانا انسانی ذہانت کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسکراہٹ انسان کے لئے فطرت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ کہ یہ ہمارے زخموں کا مرہم اور دکھوں کا علاج ہے۔

دنیائے ادب میں بھی مزاح کی حیثیت واہمیت ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک۔ چنانچہ کسی بھی زبان کا معیاری اور صحت مند ادب خالص مزاحیہ تحریروں سے خالی نہیں ملے گا۔ بلکہ بعض اوقات ایسی تحریریں ہی اس کے لئے سرمایہ افتخار وامتیاز ہوتی ہیں۔

ہمارے یہاں اردو ادب کا دامن بھی مزاح کے سدا بہار شگفتہ رنگوں سے سجا ہوا نظر آتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ سے لے کر شوکت تھانوی تک اور پطرس بخاری اور شفیق الرحمٰن سے مشتاق احمد یوسفی تک ہر دور میں مزاح کے رنگا رنگ پھولوں نے ہمارے ادب کو منور اور معطر رکھا ہے۔

مرحومہ پروفیسر خورشید جہاں کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل کتاب ''ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟'' اسی رنگ وخوشبو کی حامل ہے۔ جس میں ان کے چودہ مضامین ..... ''من کہ''..... ''اعجاز مے''..... ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟..... نائم بانڈ پر وموشن..... نیا پے سکیل..... میری قدر..... شوگر نامہ..... قرض کی پیتے ہیں..... دام تمنا..... کٹے زندگی مستی سے..... سنئے کہ نہ سنئے..... وہ ایک دن..... بچت کے ہاتھوں..... اور مجھے میری ہر دلعزیزی نے مارا'' شامل ہیں۔

کتاب کے آغاز میں مصنفہ مرحومہ کے شوہر نامدار ڈاکٹر جلیل اشرف نے ''دو حرف'' کے عنوان سے چند سطور لکھی ہیں۔ بقول ان کے ''مرحومہ نے جو کچھ لکھا ہے ان کے اپنے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو تلخ ہیں۔ لیکن انہیں قابل قبول بنانے کے لئے انشائیے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔''

معروف مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے پیش لفظ ''دروازہ خاور کھلا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ وہ خواتین کے لکھے ہوئے مزاح کو بیگماتی مزاح کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مرحومہ کے مزاح میں ملائمیت نسبتاً زیادہ ہے اور اس ملائمیت کو نبھانے کا سلیقہ بھی شاید انہی کا حصہ ہے۔ خورشید جہاں کا مزاح بھی ان معنوں میں بیگماتی مزاح ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ موصوفہ طنز نہیں فرماتیں۔ وہ صرف دل بہلاتی ہی نہیں دل دکھاتی بھی ہیں اور اس رویئے میں بھی اس بات کی احتیاط ملحوظ رکھتی ہیں کہ دل صرف اتنا دکھے کہ چیخ نہ جائے۔ وہ نشتر زنی نہیں فرماتیں۔ صرف نوک قلم چبھو کر بتاتی ہیں کہ مواد فاسد کہاں ہے؟ وہ ہلکی سی چٹکی بھی لیتی ہیں۔ تو ٹیس نہیں اٹھتی۔ صرف کسک کا لطف انگیز احساس ہوتا ہے۔''

کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے ممتاز نقاد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں۔ ''ظرافت اگرچہ خوشرنگ لبادہ ہے تو طنز کڑوی گولی اور نیم کی بنولی ہے۔ طنز کے باعث تلخی سہی۔ مگر طنز نگار تلخی کو خالص صورت میں بیان کرنے کے برعکس مزاح سے ذائقہ خوشگوار بنا کر قاری کے لئے اسے زود ہضم بنانے کی سعی کرتا ہے۔ ہماری تنقید میں طنز ومزاح مترادف کے طور پر سمجھے جاتے ہیں اور یوں دونوں کے جداگانہ کردار کو یکساں قرار دیتے ہوئے ان میں وحدت پیدا کر دی جاتی ہے۔ جو کہ غلط ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''ہر چند مزاح اور طنز سماجی رویئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود دونوں جداگانہ نوعیت اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک تحریر میں یہ دونوں رنگ آمیزی کر رہے ہوں۔ مزاح کم کم بادوباراں کی مانند اور طنز کیکٹس کی صورت میں، ادبی تحقیق میں ژرف نگاہی سے کام لینے والی خورشید جہاں طنز میں بھی باریک بینی کا ثبوت دیتی ہیں۔ مگر اس

میں بھی دوسروں کے بجائے خود کو ہدف قرار دے کر اپنے قلم سے خود پر چاند ماری کی ہے۔جو آسان نہیں۔خورشید جہاں کے طنز میں یہی رنگ غالب نظر آتا ہے۔اپنی ذات کو موضوع اور مرکز ہدف بنانا ہی مشکل کام ہے۔کہ ذات کے تذکرے میں اگر ایک انتہا پر تعلی ہے تو دوسری پر خود ترسی۔اوران دو انتہاؤں کے درمیان عمل اور ردِعمل کے متنوع اسالیب۔''

اب آیئے کتاب کی طرف ..... پہلا مضمون ہے۔''من کہ''۔جس میں ایک مڈل پاس بیوی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا دلچسپ قصہ بیان کیا گیا ہے۔اس تحریر میں جہاں ہمارے امتحانی نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔وہاں کالجوں میں تدریس کے گھسے پٹے انداز پر خوب لے دے کی گئی ہے۔

''اعجاز مئے''.....میں ہمارے نظام امتحان اور اس میں ایگزامینر کے رول کے حوالے سے رازہائے درون خانہ پر سے نہایت فنکارانہ انداز میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔''ہوئے کیوں نہ غرق دریا؟''.....میں ہندوستان کے کالجوں میں ہندی زبان کے مقابلے میں اردو کے طالب علموں کی ذہنی حالت زار کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

''نائم باؤنڈ پروموشن''.....ایک پی ایچ ڈی استاد کی ترقی (پروموشن) کا شگفتہ تذکرہ ہے۔تو ''نیا پے سکیل'' ایک تنخواہ دار ملازم کے خوابوں کا گوشوارہ ''میری قدر'' میں معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں کا شگفتہ انداز میں ذکر ہے تو ''شوگر نامہ'' ذیابطیس کے مریض کی لطیف آپ بیتی۔

''قرض کی پیتے ہیں''.....میں قرض لینے اور قرض دینے کے نئے فلسفے پر اچھوتے اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور اسی سلسلے میں ''دام تمنا'' اور کٹے زندگی مستی سے اس موضوع پر دلچسپ تحریریں ہیں۔

''سنئے کہ نہ سنئے''.....میں باتونی لوگوں اور خاص طور پر شاعروں کی ایک قسم کا پر لطف تذکرہ ہے۔جو زبردستی ہر کسی کو اپنا کلام سنواتے ہیں۔

''وہ ایک دن''.....شوہروں اور بیویوں کے فرائض کے سلسلے میں ایک اچھوتے موضوع پر

مبنی ہے۔اس میں ہفتے کے ایک دن فریقین کے مقررہ فرائض الٹ جاتے ہیں۔اس طرح جو مضحک صورتحال پیدا ہوتی ہے۔اسے نہایت خیال انگیز اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

''بچت کے ہاتھوں''.....میں بچت کے مختلف طریقے بیان کرتے ہوئے مصنفہ کو بچت کے ہاتھوں ہی لٹتا دکھایا گیا ہے جس میں زبردست طنز پوشیدہ ہے۔

''مجھے میری ہر دلعزیزی نے مارا''میں حلقہ احباب کی بے دریغ وسعت اور مروت بیان کرتے ہوئے عاشق نما بھائی اور بھائی نما عاشق کے دلچسپ کردار پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔

مرحومہ خورشید جہاں پیشہ تدریس سے وابستہ تھیں اور ان مضامین میں انہوں نے زیادہ تر اپنے پیشے سے متعلق موضوعات مثلاً نظام امتحان۔کلاس روم اور ایگزامینر شپ وغیرہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔گویا اپنے اردگرد کی حقیقی زندگی ان کا موضوع ہے اور موصوفہ کے تیز مشاہدے اور گہرے ذاتی تجربے کی بنا پر ان مضامین میں صداقت اور اخلاص کا پہلو نمایاں ہے۔زندگی کے ٹھوس تجربات اور حقائق نے انہیں جو شعور اور ادراک بخشا ہے۔اس کی جھلک ان کے تقریباً ہر مضمون میں نظر آتی ہے۔

آخر میں ہر تحریر قاری کے لئے ایک لمحہ فکریہ چھوڑ جاتی ہے اور یہی سوچ ان مضامین کی خصوصیت ہے۔دلچسپی کے لحاظ سے تمام مضامین اول تا آخر قاری کو اپنی گرفت میں لئے رکھتے ہیں۔جو ان تحریروں کی کامیابی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

خورشید جہاں کا اسلوب تحریر عام طور پر سادہ اور مختصر ہے۔اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں ایک بے تکلفی اور بے ساختگی کی فضا ہے۔پھر ان کے مضامین میں ایک سا موضوع ہونے کے باوجود یکسانیت نہیں۔بلکہ ایک تنوع ملتا ہے۔جو پڑھنے والے کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔اگر کوئی مضمون نگار اپنی تحریروں میں صرف اور صرف مزاح اجاگر کرنے کی کوشش کرے۔تو خدشہ ہے کہ اس میں کہیں پھکڑ پن پیدا ہو جائے۔اسی طرح اگر وہ مضامین میں فلسفہ آرائی اور خیال انگیزی سے کام لے۔تو اس کی تحریریں پیوست کا شکار ہو سکتی ہیں۔لیکن خورشید جہاں کے

یہاں ایسا بالکل نہیں ۔ان کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی ہلکی آمیزش بھی ہے اور اسی توازن کے باعث ان کے مضامین میں دلچسپی اور شگفتگی کا عنصر پوری طرح قائم ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

ان مضامین میں وہ موضوع سے متعلق دلچسپ تفصیلات اس انداز سے بیان کرتی ہیں کہ یہ جزئیات نگاری قاری کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ان کے موضوعات اگرچہ زیادہ تر ذاتی ہیں لیکن اپنے دلچسپ اسلوب کی ....وہ عام قاری کے لئے بھی باعث لطف ہیں۔

ان مضامین کو کتاب میں انشائیوں کا نام دیا گیا ہے۔جو محلِ نظر ہے۔کیونکہ صنف انشائیہ اردو ادب میں اب اس مقام پر ہے کہ انہی خصوصیات کی بنا پر اسے دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ انشائیے کی بہت سی صفات اپنے اندر رکھنے کے باوجود ہم انہیں خالص انشائیہ نہیں کہہ سکتے ۔ہاں ان میں انشائیے کی کچھ کچھ جھلکیاں ضرور موجود ہیں۔درحقیقت یہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھے ہوئے مصنفہ کے ایسے شگفتہ مضامین ہیں جن میں مزاح بھی ہے اور طنز بھی۔دلچسپی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ انبساط بھی ہے اور فکر بھی اور یہی ان مضامین کی انفرادیت ہے۔الغرض ہمارے عہد کے شگفتہ اور لطیف ادب میں خورشید جہاں مرحومہ کی یہ کتاب ایک خوبصورت اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

عاصی کرنالی کی ''رگِ جاں''

قیام پاکستان کے بعد جہاں ہماری سیاسی و معاشرتی تاریخ نے ایک نئی کروٹ لی ہے وہاں ہمارے کلچر اور ادب میں بھی ایک نمایاں انقلاب رونما ہوا ہے یہ انقلاب اس سیاسی و معاشرتی انقلاب کی طرح تند و تیز اور فوری نہیں تھا۔بلکہ بڑی آہستگی اور خاموشی سے جدید اذہان میں جاری وساری رہا۔اسی انقلاب کے نتیجے کے طور پر پاکستان میں مختلف ادبی تحاریک کا وجود عمل میں آیا۔ حلقہ ارباب ذوق مرحوم میراجی اور ان کے چند اور ابہام پسند مصنفین کے سہارے تقسیم ملک سے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا۔لاہور اس حلقے کا بڑا مرکز تھا۔انجمن ترقی پسند مصنفین بھی حلقے کے ساتھ قائم ہوئی۔البتہ انجمن آزاد خیال مصنفین اور حلقہ ادب اسلامی صرف اسی دور کی پیداوار ہیں۔ان ادبی اداروں میں بعض کے پیش نظر خالص ایمائی اور تخیلی ادب اور بعض کے پیش نظر ٹھوس اور زندگی سے قریب ادب کی تخلیق تھی۔گویا اول الذکر ادب برائے ادب اور مؤخر الذکر ادب برائے زندگی کے علمبردار تھے۔ساتھ ہی ساتھ پاکستانی ادب ''قومی ادب'' ''مقصدی ادب'' اور ''اسلامی ادب'' کے نام سے مختلف تحاریک پیدا ہوئیں جن میں اسلامی ادب کی تحریک بھی خاصی جاندار تھی کہ اسے خاص طور پر جماعت اسلامی کی حمایت حاصل تھی۔اب گویا ادب میں حلقہ ادب اسلامی کے تحت خالص اسلامی اور مقصدی ادب کی تحریک باقاعدگی سے شروع ہو چکی تھی ''تعمیر انسانیت'' ''چراغِ راہ''۔تسنیم،ایشیا،ترجمان القرآن'' ''میثاق،'' ''فاران'' شہاب اور پھر سیارہ ایسے جرائد و رسائل تھے جو صرف اسلامی اور مقصدی ادب ہی کی ترویج و اشاعت کیلئے وقف تھے۔

اسلامی تحریک کے نوجوان ادباء و شعراء میں نعیم صدیقی کوثر نیازی اور اسعد گیلانی تحریک میں شامل تمام نوجوان لکھنے والوں کی قیادت کر رہے تھے کہ عاصی کرنالی ایک سچے اسلام پسند شاعر

کی حیثیت سے اس تحریک میں غیر شعوری طور پر شامل ہوئے اور اس کو اس حد تک اپنایا کہ اپنے زورِ قلم سے تحریک کے قائدین کی صفِ اول میں جا ملے۔

انہی دنوں عاصؔی صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "رگِ جاں" شائع ہوا۔ رگِ جاں کی اشاعت تحریک ادبِ اسلامی میں ایک گراں بہا اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

"رگِ جاں' کا عاصی کرنالی اپنے ہمعصر اسلامی شعراء کی طرح علامہ اقبال سے بہت حد تک متاثر ہے کسی بڑے فن کار سے متاثر ہو کر لکھنا اچھا بھی ہے اور برا بھی۔ اچھا یوں کہ نو آموز لکھنے والوں کے لئے سوچنے کا ایک خاص انداز مہیا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی مشق کی خاطر اس فنکار سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو کر اپنے لئے فن کی ٹھوس بنیادیں بنانے کے قابل ہو جاتے ہیں اور برا یوں کہ اس اثر پذیری میں پختہ مشق لکھنے والوں کی اپنی شخصیت کی انفرادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

عاصی کرنالی یقیناً موخر الذکر طائفے سے تعلق رکھتے ہیں وہ اقبال سے شدید متاثر اور ذہنی و قلبی طور پر بہت قریب ہیں۔ ویسے پورے برصغیر میں اقبال ہی ایک ایسے شاعر ہیں۔ جن سے موجودہ دور کے کم و بیش تمام شعرا متاثر ہوئے ہیں۔ عاصی کرنالی خصوصاً اپنی نظموں میں اقبال ہی کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ مواد اور ہیئت، زبان اور اسلوب سب میں اقبال کا گہرا عکس جھلکتا ہے۔

"رگِ جاں' کا حصہ منظومات "شانہ صبا تقریباً سارے کا سارا اسی انداز کا حامل ہے۔ خاص طور پر ان کی نظمیں "مسلمان کی فطرت" "کربلا۔ 'دبا دیہ پیمائے حجاز سے" خاتون حرم کی خدمت میں 'خلا' "نگاہ سے دل تک"۔ "دخترِ تہذیبِ حاضر کے نام"۔ "جائزہ"۔ "تحریک' اور "ترمیم" خالص اقبال ہی کے اسلوب میں لکھی گئی ہیں اور بلا شبہ بڑی کامیاب نظمیں ہیں اور پھر ایک نظم "بارگاہِ اقبال میں' تو ان کے اقبال سے تمام ذہنی و فکری تعلق کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کے رنگ میں ان کی یہ نظمیں اقبال ہی کے سے انداز میں وہی لفظوں کی مناسب اور پر وقار نشست و برخاست، وہی خیال کی رفعت و پاکیزگی اور وہی اسلوب کی شگفتگی و ندرت ان میں جا بجا نظر آتی ہے۔

ان نظموں کے علاوہ عاصؔی صاحب نے کچھ نعتیں بھی کہی ہیں۔ نعت ایسی مشکل اور رفیع صنفِ سخن میں بھی وہ نظم اور غزل کی طرح کامیاب ہیں۔ خاص طور پر ان کی نعتیں "رونق فروزِ بزمِ امکاں"۔ 'جانِ دو عالم"۔ "اعتذار بہ بارگاہِ رسالت"۔ اور "محسنِ اعظم' ہماری نعتیہ شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

"فتنۂ انکارِ حدیث"۔ "فتح مکہ"۔ "شہدائے بالاکوٹ"۔ "اللہ تیری شان ہے" اور "دخترِ ملت" ان کی خالص ہنگامی اور مذہبی قسم کی نظمیں ہیں۔ جن میں تبلیغ و وعظ کا عنصر زیادہ اور خالص شعریت کچھ کم ہے۔

عاصؔی صاحب کے ہاں "رومان" بھی ملتا ہے مگر بہت ہلکا ہلکا۔ وہ رومانی ہوتے ہوئے بھی اصلاح، مقصد اور زندگی کے حقائق کو نہیں بھولتے۔ "رس کی آخری بوند"۔ "پھولوں کا ہار" اور "مال روڈ پر" ان کی کامیاب رومانی نظمیں ہیں۔ جن میں لطیف سے رومان کے ساتھ ساتھ مقصد اور زندگی بھی ملتی ہے۔

"یہ سوداگر" اور "لال قلعہ' عاصؔی صاحب کی دو قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ ان دو نظموں میں ان کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے اور بلا شبہ ان کی مقصدی شاعری کے یہ دو بہترین نمونے ہیں۔ "یہ سوداگر" خالص سماجی تنقید ہے۔ جو بڑی خوبصورتی سے شعر کے جامے میں سما گئی ہے۔ "لال قلعہ" ہماری عظیم تاریخ کا ایک پُرشکوہ ورق ہے۔ جسے عاصؔی صاحب نے بڑے فنکارانہ انداز سے نظم کیا ہے ان کی یہ دو نظمیں ہر لحاظ سے یادگار اور ہماری شاعری میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

"پیمبرانِ ادب" "محرومیٔ احساس" "اہلِ کشمیر کی جانب سے" "بہت سے لوگ"۔ "مزدور کے دشمن اور "مستی کردار" ان کی مختلف موضوعات پر ایسی نظمیں ہیں جو جدید نظم میں ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔

عاصؔی صاحب بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ فطرتاً وہ وضعدار، شکوہ پسند اور رفیع الذہن ہیں۔ اور نظم کے اسلوب میں رفعت اور شکوہ لازمی اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ نظم ان کی

محبوب صنفِ سخن ہے۔اس لحاظ سے ہم انہیں ایک کامیاب نظم گو کہہ سکتے ہیں۔ان کی طبیعت میں یہ نظمیت اس حد تک ہے کہ ان کی غزل بھی غزل مسلسل بن کر رہ گئی ہے یعنی ان کی غزلوں میں بھی نظم کا عنصر زیادہ کارفرما ہے۔

''رگ جاں'' میں انہوں نے غزلوں کے دو حصے کئے ہیں۔ایک حصہ ''محراب حرم'' ہے اس میں زیادہ تر ایسی غزلیں ہیں جو اقبال کی عام غزلوں اور خاص طور پر 'بال جبریل' کی غزلوں سے مواد اور اسلوب کے لحاظ سے کافی متاثر ہیں۔مثلاً

نظر میں ذوق نظر نہیں ہے
جگر میں سوزِ جگر نہیں ہے

ع اگر خدا تجھے دے دولتِ مذاق سلیم
ع وہی ریا وہی تسبیح و خرقہ سالوس

ع دلوں کے ظرف چھوٹے ہیں نظر محدود ہے ساقی!
ع کیا قبول جو میں نے مجاہدوں کا طریق
ع زمیں سے عرش بریں تک مجاہدوں کی زقند

اور

ع آزادیٔ افکار پہ ایماں کی ہے بنیاد

ایسی ہی غزلیں ہیں جن میں اقبال ہی کا فلسفۂ حیات اور فلسفہ خودی اور اقبال ہی کا اندازِ بیاں رواں دواں نظر آتا ہے۔

غزلوں کا دوسرا حصہ ''زہر و تریاق'' کے نام سے ''رگ جاں'' کے آخر میں ہے یہ غزلیں عاصی صاحب کی کامیاب غزلیں ہیں اور خاص طور پر

ع دشتِ غم میں ابرِ عشرت بار بن کر آیئے!
ع غم کے شعلے جو ضیا بار نظر آتے ہیں
ع جو چشم شوق بن کے نظاروں میں ڈھل گئے
ع بہاروں پر جوانی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے!
ع وفا کا راز تھے ہم لوگ جس کو پا نہ سکے
ع وہ لب متبسم ہوتے ہیں وہ زلف پریشاں ہوتی ہے

ایسی غزلیں ہیں جن پر عاصی صاحب جتنا ناز کریں کم ہے اور ہم انہیں بلا جھجک جدید غزل کے انتخاب میں ایک نمایاں جگہ دے سکتے ہیں۔

آخر میں رگِ جاں سے ایک مختصر انتخاب۔

حدود لامکاں سے بھی جو آگے ہیں وہ دیوانے
ٹھہر جائیں تو کیا ہوگا سنبھل جائیں تو کیا ہوگا

مال عزتِ اہلِ حرم خرید لیا
خوشی تو مل نہ سکی میں نے غم خرید لیا

تو زمیں کو فتح کر لے میں فلک پہ تیر ماروں
ترے پاس چند آنسو مرے ہیں چند آہیں

روحِ منظر نہ بنے جانِ بہاراں نہ بنے
لوگ کانٹوں سے گزر کر بھی بہاراں نہ بنے

نعمت درد سے محروم رہا گوشۂ دل
بن گئے لوگ فرشتے مگر انساں نہ بنے

یہ واقعہ ہے کہ ہم بت کدے سے اٹھے تھے
یہ تجربہ ہے کہ ہم بت کدے سے جا نہ سکے

اس دور میں اصول کا جھگڑا فضول ہے
انسان جو قدم بھی اٹھا لے اصول ہے

(۱۹۶۰ء)

☆☆☆☆☆☆

قتیل جعفری کی شاعری

ڈاکٹر قتیل جعفری، شعر و ادب کی ان شخصیات میں سے تھے جو اپنی شخصیت کی تہ داری کے لحاظ سے ہر دور میں مسلم رہی ہیں۔ قتیل صاحب بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ایک سچے شاعر، خلوص سادگی اور فقر سے ان کی زندگی عبارت ہے اور یوں ہونا بھی چاہئے۔ کہ ابتدا ہی سے وہ صوفیانہ اور شاعرانہ ماحول سے متعلق رہے ہیں جو زیادہ تر ان ہی کے اپنے خاندان کی وراثت میں سے ہے۔ وہ بیک وقت اردو، فارسی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری بھی ان کی شخصیت کی طرح ہمہ صفت اور ہمہ پہلو تھی۔ مگر ہم یہاں صرف ان کے ایک پہلو یعنی ان کی اردو شاعری کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ قتیل صاحب اساسی طور پر خالص شاعر تھے۔ سچا فن کارانہ خلوص، پروقار سادگی اور قلندرانہ فقر انہ کی شخصیت کی عمارت کے ستون تھے۔

قتیل صاحب مولانا گرامی کے خوشہ چین اور حفیظ اور ساحر ہوشیار پوری ایسے نامور شعراء کے ہمعصر تھے لیکن گرامی کے سوا حفیظ اور ساحر سے انہوں نے کبھی کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ گرامی سے بھی انہوں نے زیادہ تر اپنی فارسی شاعری کے سلسلہ میں استفادہ کیا ہے۔ جہاں تک ان کی اردو شاعری کا تعلق ہے وہ حقیقتاً علامہ اقبال کے گہرے مطالعے کا اثر ہے اس کے علاوہ شمس تبریز اور مولانا روم کے افکار کی بازگشت بھی ان کے کلام میں ملتی ہے۔ اردو کے دوسرے شعراء جن سے انہوں نے شعوری طور پر اثر قبول کیا ہے وہ میر تقی میر اور خواجہ میر درد ہیں۔ شاید اس اثر پذیرائی کی بڑی وجہ ان کی طبیعت کی سادگی اور درویشی ہو۔ ایسی درویشی جس میں معرفت قلب ونظر کے اعلیٰ و ارفع مقام سے آشنائی ہو۔ دراصل وہ اسی اعلیٰ وارفع مقام اور منزل کے راہی بلکہ رہبر تھے۔ ان کی ساری کی ساری شاعری ایک پیغام ہے اسی منزل کی طرف بڑھنے کا۔

اُن کے ہاں فلسفہ بھی ہے۔ تصوف بھی۔ اخلاقیات بھی ہے اور تغزل بھی!

وہ اقبال کی طرح وحدت حق کے پیامی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وحدتِ ملت کے پیامبر وہ دنیا میں ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں بندہ و آقا کی تمیز نہ ہو۔جس میں علم کو تجارت سمجھ کر فروخت نہ کیا جا سکے۔جس میں شکم کے خدا کی خدائی نہ ہو۔خود کی چیرہ دستیاں نہ ہوں۔عشقِ بلا خیز کا دور دورہ ہو۔وہ ایسا نظام چاہتے ہیں جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو اور جو انسانیت کو اس کے مستقبل کے خطرات سے محفوظ و مامون رکھے ان کا پیام خالص عشق کا پیام ہے۔وہ عشق کے بندے ہیں۔حسن ان کے نزدیک کائنات کے مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے جو باوجود کثرت اظہار کے ایک وحدت ہے عشق کو وہ لازمہ زندگی سمجھتے ہیں حسن اور عشق ہی اُن کے نزدیک دو ایسی قوتیں ہیں جن کی باہمی آمیزش اور آویزش سے نظامِ کائنات چل رہا ہے اور انہی کے عروج و زوال سے کائنات کا عروج و زوال وابستہ ہے۔

زندگی کو وہ عشق کا حاصل سمجھتے ہیں۔موت ان کے نزدیک زندگی کے سمندر کا سکون اور سکوت ہے۔یعنی ایک کنارا۔

جعفری صاحب کے ہاں اس وقیع فلسفہ کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی اخلاقیات بھی ہے۔

تصوف کا رنگ ذرا زیادہ گہرا ہے مگر یہ تصوف خالی عجمی نہیں زندگی آمیز اور زندگی آموز تصوف ہے جس کا سالک منزل کو بھی سنگِ راہ سمجھتا ہے اور رواں دواں رہنے ہی کو اصلِ حیات جانتا ہے عشق اس کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے حسن اس کا مرکزِ کشش ہے حسن سے باہر اگر کوئی دائرہ ہے تو وہ ماسوا کا جہاں پہنچ کر سالک سالک نہیں رہتا بلکہ خود منزل بن جاتا ہے۔

ان کا فلسفہ اقبال سے متاثر ضرور ہے۔مگر ایسا بھی نہیں کہ خود ان کی اپنی انفرادیت اس میں دب کر رہ گئی ہو۔وہ اقبال کی تقلید تو کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی آواز کی انفرادیت کو بھی ختم نہیں ہونے دیتے۔

تصوف میں وہ قدرے میر درد اور شمس تبریز سے متاثر ہیں لیکن یہ تاثر بھی کچھ زیادہ واضح نہیں کہ انہوں نے اپنے لئے علیحدہ راہیں منتخب کی ہیں۔

قتیل صاحب نظم بھی لکھتے تھے اور بے تکان ہمہ قسم موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے

تھے۔خاص طور پر آزادی، انقلاب، اور وحدتِ ملت ایسے موضوعات پر ان کی بعض نظمیں بڑی کامیاب ہیں جو بلا شبہ ہمارے قومی اور ملی ادب میں ایک اہم مقام کی حامل ہیں۔

وہ نعت اور منقبت۔سلام اور مرثیہ و نوحہ بھی لکھتے ہیں اور ان اصناف میں خاصے کامیاب ہیں۔ایک بات جو خالص فنی لحاظ سے قابل ذکر ہے ان کے کچھ ساقی نامے ہیں جن میں انہوں نے کہیں کہیں مواد اور ہیئت کے بعض اچھوتے تجربے بھی کئے ہیں۔ساقی ناموں کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

تیرے میخانے میں بادہ ہے نہ جام اے ساقی
کسی میکش کا نہیں کوئی مقام اے ساقی
تو نے لوٹی ہے مرے جذبہ دل کی مستی
تو نے چھینا ہے مرا ماہ تمام اے ساقی
بند ہے تیرے تقدس میں زبان لاچار
گھٹ رہا ہے دلِ مفطر میں کلام اے ساقی!
تیرا مے خانہ تو کیا تو بھی مرا ہو جائے
میں سمجھتا ہوں مرا عشق ہے خام اے ساقی

اور

اٹھے گی دل سے پیاسوں کے جو آہِ آتشیں ساقی
جلا کر خاک کر دے گی ترا خلد بریں ساقی
جہانِ میکدہ میں یا خدا کیا انقلاب آیا
کہیں بادہ کہیں ساغر کہیں خم ہے کہیں ساقی

نظم کے علاوہ وہ خالص غزل کہنے پر بھی قادر ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غزل گوئی ہی انہیں ایک صاحب طرز شاعر کا درجہ عطا کرتی ہے۔

غزل میں ان کا اپنا اسلوب ہے جو ہزاروں میں صاف پہچانا جاتا ہے۔ان کی آواز قدرے بلند اور شوخ ہے۔مگر غیر متوقع نہیں۔اس میں اعتدال اور توازن موجود ہے۔مواد کے لحاظ سے ان کی غزل جدید غزل کے زمرے میں تو نہیں آسکتی، البتہ قدیم سے ان کا رشتہ ضرور قطع کرتی ہے اور اس طرح وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک نئے دور کی عکاس ہے۔جس میں وہ قیام پاکستان سے

قبل کی غزل سے زیادہ قریب ہے۔لیکن یہ قرب قیام پاکستان کے بعد کے جدید غزل گو طبقہ سے بھی کسی حد تک قائم رہتا ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قتیل صاحب جدید غزل گو شاعر ہیں جدید ترین نہیں۔

غزل کی ہیئت تو تقریباً ہر دور میں مشترک رہی ہے۔البتہ اس کے مواد میں ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک نت نئے تجربے اور روایات ملتی ہیں

ان کی غزل میں صحت مند زندگی اور عشقِ صادق ہے جو ایک ایک مصرعے میں جاری و ساری ہے فن کارانہ خلوص اور ایک پر وقار سادگی ہے جو ان کے پورے کلام کا طرۂ امتیاز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں بھی قائم ہے۔دل کی بات وہ بے جھجک اور بے پرواہو کر من وعن بیان کر دیتے ہیں اور اظہار کی سادگی خلوص اور بے ساختگی اس میں تاثیر کا اعجاز پیدا کر دیتے ہیں ان کی بعض غزلیں تو اپنے اسلوب کے لحاظ سے بلا شبہ ایک نئی منزل کا پتہ دیتی ہیں۔

زبان وبیاں کے لحاظ سے بھی ان کا پورے کا پورا کلام فنی استقام سے یکسر پاک ہے اور ایک پنجابی ہوتے ہوئے بھی وہ اکثر اہل زبان شعراء سے کسی طور کم نہیں۔انہیں زبان پر ماہرانہ قدرت حاصل ہے۔فارسی میں خاصی دسترس ہے۔اس بنا پر وہ اکثر فارسی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان کا استعمال اس خوبصورتی سے ہوتا ہے کہ بجائے ثقالت کے ایک قسم کی لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔آخر میں ان کے کلام کا انتخاب ملاحظہ فرمایئے۔

جو دل کہ دردِ عشق صنم میں حزیں نہیں
اُس دل کی روح حاصلِ روح امیں نہیں

بے سوزِ عشق دل کی حقیقت نہ پوچھئے
محمل ہے جس میں لیلیٰ محمل نشیں نہیں

یہ بھی عجیب مطلقِ خود سر ہے دوستو!
شہ رگ کے جو قریں ہے وہ دل کے قریں نہیں

ہم جانتے ہیں قصۂ منصور و دار کو
یہ تو اسیرِ گیسوئے جاناں کی بات ہے

ہوتی ہیں چشمِ یار کی فتنہ طرازیاں
کہتا ہے دل کہ گردشِ دوراں کی بات ہے

مومن کی دید میں تو ہے انسان ظہورِ حق
کافر کے ہے گماں میں وجودِ خدا فریب

ہماری توحید کی نظر میں خدا صنم ہے صنم خدا ہے
صنم ہمارے خدا ہمارا، خدا ہمارا صنم ہمارے

بتکدے میں جب گئے لب پر خدا کا نام تھا
کعبے میں لیتے ہوئے اک بت کا نام آئے ہیں ہم

عشق والوں کا کوئی سجدہ ادا ہو جائے
اتنا خوددار صنم ہو کہ خدا ہو جائے

خزاں کو شوکتِ فصلِ بہار دی ہم نے
جہاں گئے وہی محفل سنوار دی ہم نے

ہم اپنی زیست یہ کہہ کر گزار دیتے ہیں
گزار دینے کی شے تھی گزار دی ہم نے

مرے ایماں کا حاصل بن گیا ہے
خیال ان کا ہی منزل بن گیا ہے

جب الجھتی ہے تو سلجھاتے ہیں زلفِ یار کو
دار پر تجدیدِ رسمِ عاشقی کرتے ہیں ہم

مے خانہ سارا رندِ بلا نوش پی گئے
ہم کو سنا دی کوثر و نہر لبن کی بات

بتوں کے عشق میں عشقِ خدا کریں اے قتیل
خدا کے عشق میں عشقِ بتاں کئے جائیں

غرض قتیل جعفری صاحب کی شاعری اپنی سادگی، خلوص اور پیغام کے لحاظ سے ہمارے ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے اور خود قتیل صاحب ہر لحاظ سے ایک مکمل فن کار اور صاحبِ طرز شاعر ہیں جنہیں آج نہیں تو کل ہماری شعری ادبی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

(۱۹۶۱ء)

☆☆☆☆☆☆

عزیز کی غزل گوئی

حضرت عزیز حاصل پوری ایک ایسی شعری شخصیت تھے۔ جن کی فنی بوقلمونی ہر لحاظ سے مسلم اور عہد آفرین ہے ان کے کلام کی رنگا رنگی اور قدرتِ بیان کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیک وقت غزل، نظم، قطعہ، رباعی مثنوی، قصیدہ اور نعت کے شاعر تھے، اور یہ بات عہدِ حاضر کے بہت کم شعراء میں موجود ہے پھر وہ اردو کے علاوہ پنجابی، ملتانی اور فارسی زبان میں بھی یکساں روانی اور صفائی کے ساتھ شعر کہتے تھے، غرض ان کی شخصیت ہر لحاظ سے جامع حیثیت ہے یہاں ہم ان کی صرف ایک فنی حیثیت کا جائزہ لیں گے اور وہ ہے ان کی غزل گوئی۔

عزیز پیدائشی شاعر تھے ان کا کلام خلوص، صداقت اور حسن سے عبارت ہے۔ وہ صحیح معنوں میں شاعر تھے۔ خالص آمد کے شاعر، آورد اور لفاظی سے انہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ بقولِ خود وہ دل سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاثیر اور تاثر ہی شعر کی جان ہیں۔ ان کے پورے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد جو بات قاری کے دل پر بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے وہ ان کا خلوص ہے، سچا خلوص، جس کے بغیر کوئی فن پارہ اعجاز کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا اور یہی وہ فنکارانہ خلوص ہے جو ان کی شخصیت میں کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ان کے فن اور شخصیت میں امتیاز مشکل نظر آتا ہے۔

صاف گوئی مری فطرت ہے عزیز
جو زباں پر ہے وہی ہے دل میں

اس خلوص کے ساتھ ساتھ ایک باوقار سادگی بھی ان کے فن اور شخصیت کا ممتاز عنصر ہے وہ تکلفات کو چھوڑ کر سادگی پر جان چھڑکتے ہیں۔ حسن سادہ کے دلدادہ ہیں ان کے نزدیک سادگی ہی حسن کا معیار ہے۔

تجھ پہ حسنِ تکلفات نثار!
اک ذرا پھر وہ سادگی کی نظر

یا پھر ایک اور جگہ لفظی و معنوی سادگی کا اعجاز دیکھئے۔

تیرا کیا شکوہ کروں تو مرا کیا لگتا ہے؟
آج تو دل بھی مرا مجھ سے خفا لگتا ہے

عزیز بنیادی طور پر خالص غزل کے شاعر ہیں۔غزل کے اساسی موضوع عشق و حسن کے متعلق ان کا نظریہ بڑا صحت مندانہ ہے وہ ہمیشہ عشق کو حسن کے مدِ مقابل دیکھنا چاہتے ہیں اور کسی صورت بھی کمتری، عجز یا سپردگی نہیں چاہتے ان کا عشق زندگی آمیز اور زندگی آموز ہے۔

اگر ہے تو حسن میں یگانہ تو میں بھی ہوں عشق میں یگانہ
حقیقت حسن و عشق کیا ہے تری کہانی مرا افسانہ

ایک اور مقام پر وہ حسن اور عشق کو زندگی کے لازم و ملزوم عناصر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔

عشق سامانِ بہاراں حسن گلزارِ خیال
ایک اظہارِ حقیقت ایک اظہارِ خیال

اور

آنکھ بیمارِ تصور دل ہے بیمارِ خیال
اک گرفتارِ نظر ہے اک گرفتارِ خیال

ان دو شعروں میں حسن و عشق اور دل و نظر کا فلسفہ کچھا ایسے بلیغ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

غم کا احساس تمام عشقیہ شاعری کی اساس ہے۔ہماری اردو شاعری اس عنصر سے مالا مال ہے عزیز صاحب نے اس موضوع پر بعض ایسے زوردار شعر کہے ہیں کہ اردو شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔مثلا

تیرے غم کی پناہ میں ہے ابھی
ہر مسرت کی ہر خوشی کی نظر

تیرا غم ہے مری خوشی کی اساس
کتنی پختہ ہے زندگی کی اساس

ہر آہ دل زار کی آواز نہیں ہے
ہر اشک غمِ عشق کا غماز نہیں ہے

عزیز صاحب نے غزل میں مواد اور ہیئت کے بعض اچھوتے اور خوبصورت تجربے بھی کئے ۔جہاں تک مواد کا تعلق ہے وہ دہلوی نہ ہوتے ہوئے بھی دلی اسکول سے قریب ہیں اور جہاں تک فن کا تعلق ہے وہ لکھنوی تو نہیں لیکن لکھنو اسکول سے متاثر ضرور نظر آتے ہیں گویا دہلی اور لکھنو سکول کے مفید اور کار آمد عناصر کے مرقع آگرہ اسکول سے ذہنی طور پر قریب ہیں۔ویسے بقولِ خود انہوں نے ابتدائی دور میں اپنی ایک غزل بھی مذکورہ بالا سکول کے نمائندہ استاد شاعر سیماب اکبر آبادی مرحوم کو بغرض اصلاح دکھائی تھی۔گویا وجدانی طور پر سیماب ان کے استاد ٹھہرے۔ظاہر ہے کہ آگرہ اسکول سے ان کا یہ تعلق دہلی اور لکھنو سے بہر حال زیادہ مستحکم ہے۔چنانچہ ابتدائی اور پھر درمیانی دور میں وہ اسی سکول سے متعلق دکھائی دیتے ہیں۔البتہ قیام پاکستان کے بعد کہ تمام تر معاشری و سیاسی انقلاب کے ساتھ ذہنی و فکری انقلاب بھی رونما ہوا تو وہ جدید اسالیب فکر کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں سے تعمیری اور صحت مند عناصر کو اپنی شاعری کی اساس بنا لیا۔ان کی یہ کوشش کچھ شعوری نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ غیر شعوری، یا پھر نیم شعوری طور پر اپنے آپ ہوتا رہا۔اور وہ پندرہ سال کے اس طویل تجرباتی دور کے بعد قدیم و جدید سے پرے اپنی ایک الگ راہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

ان کی زبان خالص شاعرانہ ہے، غزل کی زبان، ترنم، موسیقی، روانی، سادگی، اس کی نمایاں خصوصیات ہیں، بحروں کے انتخاب میں بھی وہ اپنے فن کارانہ شعور کی پختگی کا مکمل ثبوت دیتے ہیں۔

لکھنوی اندازِ بیان کے زیرِ اثر کبھی کبھی لفظی کھیل بھی کھیل لیتے ہیں ۔اور بعض اوقات تو یہ لفظی کھیل ایک معجزے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔مثال کے طور پر

آئینہ خانے میں اس آئینہ رُخ نے دیکھا
آئینہ آئینہ، آئینہ، حیرانی ہے

کبھی لفظی تناسب کے ساتھ ساتھ اس میں سادگی بھی شامل ہو جاتی ہے تو عجیب تاثر پیدا ہوتا ہے ۔جیسے

بات کیا ہے، بات تو کیجئے کوئی
آپ کیوں خاموش ہیں کیا دل میں ہے
مجھ سے کرتے نہیں کلام عزیز
گو زباں پر مرا کلام بھی ہے
حجاب بھی ہے آپ کا تکلفات کیلئے
تکلفات ہی فقط حجاب کیلئے نہیں

اور

جواب کچھ نہ دیجئے بغور سُن تو لیجئے
مرا سوال آپ سے جواب کیلئے نہیں

تخلیق فن سے متعلق تجربات اور مشاہدات کے زیرِ اثر انہوں نے کئی منظومات مسلسل غزلوں کی شکل میں کہی ہیں ۔جو بلاشبہ ہماری شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں، جیسے

نظر کوئی آیا غزل ہو گئی
غزل کو جو دیکھا غزل ہو گئی

اور

دل کا ہر زخم کنول ہو تو غزل ہوتی ہے
کوئی موضوعِ غزل ہو تو غزل ہوتی ہے

جلوہ حسن ضروری ہے نگاہوں کے لئے
سامنے کوئی غزل ہو تو غزل ہوتی ہے

آخر میں ان کی مختلف غزلوں سے اشعار کا انتخاب پیش ہے۔

خلقتِ جلوہ تو فطرت ہے مری آنکھوں کی
حسن کیوں دیکھ رہا ہے مجھے حیراں ہو کر
ابھی تو راز رازِ انجمن ہے
عیاں ان کی جبیں پر کیوں شکن ہے
مرے آنسو ہیں یا شبنم کے موتی
ترا دامن کہ گل کا پیرہن ہے
اس سے کھلتے ہیں نظر والوں پہ اسرارِ جنوں
سرمہ چشم خرد ہے تیرے دیوانے کی خاک
جا چکے تھے ہم اس نظر سے دُور
جب وہ مائل بہ التفات ہوئی
سامنے آ گیا جب کوئی گل بدن
ہو گئے دیدہ و دل چمن در چمن
خطِ تقدیر اپنا نظر آ گیا
تیرے ماتھے پہ جب ہم نے دیکھی شکن
ہم اسیر گردش ایام ہو کر رہ گئے
بے کسی کی صبح غم کی شام ہو کر رہ گئے
اے نگاہِ دوست تیری ایک لغزش کے طفیل
لوگ کتنے موردِ الزام ہو کر رہ گئے

محشرِ افکار برپا دل میں ہے
پھر بھی تیری یاد تنہا دل میں ہے
ایک ارماں تھا اکیلا میرے ساتھ
کاش تُو بھی رات ہوتا میرے ساتھ
جادۂ الفت میں نیت کا خلوص
تیرا تیرے ساتھ میرا میرے ساتھ
بات کر کے آزمانا چاہئے
لوگ تیرے ساتھ ہیں یا میرے ساتھ
بلا کی اوس پڑی ہے عذار گلشن پر
کہاں کی آگ کہاں کی دہک کہاں کا دھواں

حقیقت یہ ہے کہ شخصی اور فنی طور پر عزیز ایسا باکمال شاعر مدتوں بعد پیدا ہوتا ہے۔

(۱۹۶۲ء)

☆☆☆☆☆☆

حیدر گردیزی۔ شخص و فن

حیدر گردیزی مرحوم ادبی دنیا کی توانا اور قد آور شخصیت تھے۔ روشن آنکھیں کشادہ پیشانی چوڑا چکلا سینہ۔ ہمیشہ ہنستا مسکراتا خوبصورت چہرہ، گفتار میں خوشبو، رفتار میں ایک رعب و دبدبہ۔ آواز میں گھن گرج۔ محفلوں کی شان دوستوں کی آن۔ امیر و رئیس ہونے کے باوجود عوامی آدمی۔ خوش لباس خوش اطوار، مشاعروں کے شاعر مجلسوں کے خطیب سراپا محبت و مروت یہ تھے حیدر گردیزی حیدر گردیزی کا تعلق سادات گردیز سے تھا۔ جو ملتان کا اہم خاندان ہے۔ مذہب ہو کہ سیاست، یہ خاندان ملتان کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ علم دوستی اور ادب پروری اس کے ایک ایک فرد میں رچی بسی ہے۔ حیدر گردیزی کو جہاں خاندانی وجاہت ورثے میں ملی۔ وہاں شعر و ادب سے دلچسپی بھی انہیں اپنے اجداد سے حاصل ہوئی۔ بڑے زمیندار اور جاگیردار ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو عوام کے قریب رکھا اور ان کی یہی خوبی انہیں عظیم انسانوں کے زمرے میں لے آتی ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ صاحب اسلوب شاعر تھے ان کی مشقِ سخن کا عرصہ کوئی پینتیس چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ پُر گو شاعر تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے پر انہیں زبردست قدرت حاصل تھی۔ ایک ایک نشست میں پچاس پچاس سو سو شعر کہنا ان کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ اُردو کے علاوہ سرائیکی اور انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے۔ سرائیکی میں ہائیکو کا پہلا مجموعہ ''ساہ دی بکل'' انہی کا ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''چاندنی کے ورق'' ''لافتی الاعلیٰ'' ''لی خمسۃ'' اور مرثیہ حبیب ابن مظاہر۔ وہ قادر الکلام شاعر تھے اور شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ غزل ہو کہ نظم یکساں روانی سے کہتے تھے۔ ان کی غزل جدید طرزِ احساس پر مبنی تھی۔ ان کے لہجے میں ندرت اور تازگی تھی جس میں الفاظ و تراکیب کی جدت کے ساتھ ساتھ خیالات کی جدت بھی شامل تھی۔ مشاعرے میں پڑھتے تو

سامعین پر چھا جاتے جس مشاعرے میں وہ ہوتے ان کے بعد کسی شاعر کا چراغ نہ جلتا۔ان کی غزل کا اگر چہ ابھی تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔لیکن مشاعروں میں ان کے کئی اشعار اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔نمونے کے طور پر ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

ذرا زمیں پہ اتر آ کہ فیصلہ ہو جائے
بلندیوں سے دریا بھی نہر لگتا ہے

اس سے ان کے خوبصورت اسلوب اور بلند آہنگ لب و لہجے کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ہائیکو جاپانی صنف سخن ہے جس کا رواج ادھر کوئی پندرہ بیس سال سے ہوا ہے۔یہ ایک مختصر سہ مصرعی نظم ہوتی ہے جس میں بڑی مہارت اور سلیقے سے ایک خیال سمویا جاتا ہے۔حیدر گردیزی نے اس طرف توجہ کی تو دنوں میں ایک مجموعہ مرتب کرلیا۔جو چاندی کے ورق کے نام سے شائع ہوا۔

حیدر گردیزی ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور حب محمدؐ و آل محمدؐ ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی چنانچہ دینی ادب کی طرف ان کی توجہ ابتدائے سخن ہی سے تھی جسے انہوں نے آخر تک نبھایا۔دینی شاعری میں حمد،نعت،منقبت،سلام اور مرثیہ ان کے خاص میدان تھے۔اس سلسلے میں ان کی تین کتابیں لافتی الاعلی لی خمسۃ اور مرثیہ حبیب ابن مظاہر منظر عام پر آ چکی ہیں اور ابھی متعدد مجموعے مرتب شکل میں اشاعت کا انتظار کر رہے ہیں۔

دینی ادب میں ان کا پہلا مجموعہ "لافتیٰ الاعلیٰ" ہے۔جو حضرت علیؑ کے مناقب اور قصامدؑ پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں مسدس۔قطعہ اور رُباعی کے پیکر میں انہوں نے حضرت علی کے حضور اپنے قلم کا نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے انیس۔دبیر،غالب اور جوش کا انہوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔چنانچہ ان کی عام شاعری پر عموماً اور دینی شاعر پر خصوصاً ان کا بہ سخن کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔خاص طور جوش کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔لافتیٰ الاعلی میں سے انتخاب کے طور پر چند اشعار دیکھئے۔

ایک مسدس کا بند ہے۔

مولا علیؑ خدائے سخن، عرش آ گہی
مولائے کل امام زماں، فخر ہر ولی

اے کعبہ یقین و عمل، حسن بندگی
قرآن کو تیرے نطق نے بخشی ہے دلکشی
قبضہ ہے تیرا اب بھی افق کے ضمیر پر
لکھا ہوا ہے نام شفق کی لکیر پر

ایک منقبت کے دو شعر۔

محبّ آل محمدؐ کے سامنے دوزخ
بھڑکتا شعلہ ہے ماچس کی تیلوں کی طرح

قلم رواں ہے مرا صورت سفیر حسینؑ
حروف چھوڑ گئے ساتھ کوفیوں کی طرح

ایک اور قطعہ

خیبر غم میں یا علی کہہ کر
یوں در آؤ کہ روشنی مل جائے
مل ہی جائیں گے پھر خدا نبیؐ
پہلے کوشش کر علیؑ مل جائے

لی خمسۃ،مناقب کا مجموعہ ہے،جو پنجتن پاک کی شان میں ہے یہاں بھی ان کا اسلوب وہی ہے جو لافتی الاعلی میں ہے یعنی وہی جذبے کی صداقت خیال کی ندرت اور اسلوب کی تازگی یہ سارا مجموعہ مسدس کی شکل میں ہے ایک حمدیہ مسدس دیکھئے۔

رکھے زمین کے ہاتھ سمندر کے آئنے
اور پانیوں کے قصر پہ موجوں کے قمقمے
تب ہو تو ماہتاب اور انجم کے رہنگے
دن ہو تو ان پہ دھوپ کے چلتے ہیں قافلے

صحرائے تند و تیز ہو وادی یا کوہسار
سب کے لب خموش پہ ہے ذکر کردگار

حضور ختمی مرتبت ﷺ کی مدح ملاحظہ فرمایئے۔

واقعہ معراج کے پس منظر میں حضور اکرم ﷺ کے مقام بلند کو کس طرح اجاگر کیا ہے۔

دیکھا قریب اپنے جو تیرے جمال کو
اللہ نے سرد کر دیا سورج کے تھال کو
پیغمبری نے چھو لیا حد کمال کو
اک لا زوال ملنے گا لا زوال کو

تارے قدم کی دھول سے بنتے چلے گئے
گزرے جدھر سے چاند ابھرتے چلے گئے

حضرت علیؑ کے حضور مدح کا ایک بند دیکھئے۔

بیداریاں ہی ساتھ رہیں تیرے ہمملا
انسانیت کو تو نے نہیں اونگھنے دیا
اسلام تیرے ساتھ سدا ہمسفر رہا
خود منزلوں نے چوم لیا حسن نقش پا
جاگا شعور، وہم کی دیوار گر گئی
ناپختگی کے ہاتھ سے تلوار گر گئی

جناب سیدہ فاطمہ الزہراؑ کی شان میں ایک بند۔

پاکیزگی کی ہو بہو تصور فاطمہؑ
اسلام کے ہے خواب کی تعبیر فاطمہؑ
اوراق روئے دیں پہ ہے تحریر فاطمہؑ
مشکل میں ہر دعا کی ہے تاثیر فاطمہؑ
مومن کا آسرا بھی ہے خیر النساء بھی ہے
مشکل کشا کے گھر میں ہے مشکل کشا بھی ہے

امام حسنؑ کی مدح میں بند۔

رحمت کے آسمان کی بارش ترا وجود
انسانیت پہ حق کی نوازش تیرا وجود
محشر میں عاصیوں کی سفارش تیرا وجود
آئینہ یقین و نگارش تیرا وجود
وہ درس دے گیا ہے دماغ حیات کو
سرسبز کر گیا ہے جو باغ حیات کو

امام حسینؑ کی شان میں یہ شعر دیکھئے۔

بھیجا ہوا خدا کا زمیں پر سفیر تھا
اسلام پر جو کٹ گیا وہ باضمیر تھا
جو حوصلوں کی جان سے گرما گیا ہے دل
سر دے کے اپنا دین پہ تڑپا گیا ہے دل

اور اب آخر میں مرثیہ حبیب ابن مظاہر میں سے ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔ رثائیت کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔

المختصر حبیب نے شبیرؑ سے کہا
مل جائے اِذنِ جنگ مجھے شاہ کربلا
ہے آرزو کہ جان کروں آپ پر فدا
مظلومیت سے رو کے یہ مظلوم نے کہا
پیری میں ہم تمہاری بھی میت اٹھائیں گے
اچھا چلو یہ داغِ جدائی بھی کھائیں گے

☆☆☆☆☆☆

احساس کے جلتے دیوں کا شاعر

یہ آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں الخبر (سعودی عرب) میں نیا نیا آیا تھا۔ یہاں کے احباب نے ایک مقامی ہوٹل میں محفلِ شعر وسخن کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں منطقہ شرقیہ کے تقریباً تمام قابلِ ذکر شعراء کے علاوہ ریاض سے جناب جاوید اختر جاوید بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ احباب نے میری پذیرائی کے لئے مجھے منصبِ صدارت پر بٹھا دیا۔ مشاعرہ ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ میں نے دیکھا ہال میں ایک صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ تقریباً ہر شخص ان کا احترام کر رہا تھا، انہیں اگلی صفوں میں بٹھا دیا گیا، میں نے اپنے ساتھ مہمان خصوصی کی نشست پر تشریف فرما جناب واصل عثمانی سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ میاں مظہر قسیم مظہر ہیں، آجکل گردوں کی تکلیف کے باعث شدید علیل ہیں، لیکن اس کے باوجود احباب سے ملنے چلے آئے ہیں۔ میں نے یہاں کے شعراء میں ان کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ اب جوان کا یہ ایثار اور خلوص دیکھا تو دل ہی دل میں ان کی شخصیت سے متاثر ہوا۔ مشاعرے کے دوران جب انہیں دعوتِ سخن دی گئی تو وہ بغیر کسی سہارے کے اسی طرح وقار سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسٹیج تک آئے اور انہوں نے نہایت پر اثر انداز میں اپنا کلام سنایا۔ سامعین دیر تک جھومتے رہے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو میرا اُن سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ آجکل آرام کو دہران میں ملازم ہیں اور کوئی پچیس برس سے منطقہ شرقیہ میں مقیم ہیں اور حال ہی میں ان کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے ''آسودگی اداس لمحوں کی'' باتوں باتوں میں جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق ملتان کے ایک نواحی قصبے تلمبہ سے ہے اور وہ ایمرسن کالج ملتان میں پڑھتے رہے ہیں اور کالج میگزین نخلستان کی جس نظم کے زیر اثر ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ وہ میری ہی نظم ''راج محل'' تھی تو فطری طور پر ایک اپنائیت سی محسوس ہوئی کہ میرا تعلق بھی ملتان سے ہے اور میں بھی ایمرسن کالج کا طالب علم رہا ہوں۔ یہ تھا ان سے میرا پہلا تعارف، میں نے

انہیں اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اس لئے کہ جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو ہم فارغ ہو کر جا رہے تھے۔ البتہ تلمبہ میں ملاقات کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہاں مشاعروں کے سلسلے میں میرا آنا جانا رہتا تھا۔ لیکن ان دنوں غالباً وہ شعر نہیں کہتے تھے یا کہتے تھے تو پبلک مشاعروں میں کم جاتے تھے۔ ہاں ان کے والدِ محترم میاں فتح محمد دلگیر جالندھری سے شاید ایک آدھ ملاقات ضرور ہوئی تھی۔ پھر میاں مظہر قسیم مظہر مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے گئے اور کچھ عرصے بعد اِدھر سعودی عرب آ گئے۔ اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن جس طرح میں نے پہلے عرض کیا ہے ان کا نام میرے لئے پہلے سے شناسا تھا۔ یہاں ریاض اور جدہ میں اکثر دوست ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ بہر حال مشاعرے کے بعد دو تین شعری نشستوں میں ان سے پھر ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ کلام ''آسودگی اداس لمحوں کی'' عطا فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ علامہ اقبال کے شیدائی اور ان کی شاعری کے دلدادہ ہیں، علامہ کے شعر وفکر کا میں بھی عقیدت مند ہوں، پھر ادبِ اسلامی کی تحریک سے ان کا تعلق ہے اور ذہنی طور پر اس تحریک کے بیشتر اہلِ قلم سے میرے بھی مراسم رہے ہیں۔ اس طرح ان سے اور قربت محسوس ہوئی۔ اب ان میں اور مجھ میں یہ ساری اقدار مشترک پیدا ہو چکی تھیں۔ ایسے میں جب ایک دن انہوں نے فون پر مجھ سے فرمایا کہ ان کی خواہش ہے کہ ان کے دوسرے مجموعہ کلام جلتے دیئے احساس کے کا دیباچہ میں لکھوں تو میں انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ اتنی قربتوں کے بعد اب تو ایک طرح سے یہ میرا حق بھی تھا۔ چنانچہ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک کے نام سے جو ادبی اور سیاسی تحریک برصغیر میں چلی، اس کا بیج باہر سے درآمد شدہ تھا۔ یہاں کی مخصوص آب وہوا میں یہ پودا زیادہ بار آور ثابت نہ ہو سکا اور تقسیم ملک کے کچھ عرصے بعد ہی یہ تحریک دم توڑنے لگی، اس لئے کہ ترقی پسندی بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں کہ ارتقاء زندگی کا خاصہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے شروع ہی سے اس تحریک کو روس کے اشتراکی نظریئے کے پرچار کے لئے استعمال کر لیا گیا تھا۔ اس طرح یہ تحریک صرف اشتراکی پروپیگنڈے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، چنانچہ قیام پاکستان کے بعد نئے سیاسی حالات اور نئے معاشرتی تقاضوں کے تحت جب یہ تحریک دم توڑ رہی تھی تو پچاس کی دہائی میں سید مودودیؒ کے

زیر اثر ادبِ اسلامی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ''فاران''۔ ''چراغ راہ'' اور ''سیارہ'' اس تحریک کے ترجمان تھے اور اسعد گیلانی، ماہر القادری اور نعیم صدیقی اس کے نمایاں قائدین تھے اور اس قافلے میں کوثر نیازی، عاصی کرنالی، پروفیسر اسرار احمد سیوہاروی، عبدالعزیز خالد، پروفیسر فروغ احمد، ابن فرید، نظر زیدی، خالد بزمی، عابد نظامی، حفیظ الرحمٰن احسن، لالہ صحرائی اور بہت سے دوسرے اہل قلم شامل تھے۔ میاں مظہر قیم مظہر اگرچہ اس قافلے میں بہت دیر بعد شامل ہوئے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اس میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی، میاں صاحب کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا۔ کیونکہ ان کے والد میاں فتح محمد دلگیر جالندھری ایک خوش گو شاعر تھے۔ میاں مظہر کی شاعری کا عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ ایک پُر گو اور مشاق شاعر کی حیثیت سے انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل سے لے کر پابند نظم تک، پھر نظم آزاد سے لے کر قطعہ اور رباعی تک، حتیٰ کہ تضمین اور ترجمے کے فن کے بھی وہ شناور رہے ہیں۔ ان کے دو مجموعے اس کا بین ثبوت ہیں۔ ان کی شاعری شعر برائے شعر کی بجائے ایک واضح مقصد کی ترجمان دکھائی دیتی ہے یعنی اسلامی قدروں کا احیا اور ان کا فروغ اور یہ اسی ادب اسلامی کی تحریک کا اثر ہے۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ مقصدیت ان کا طرۂ امتیاز ہے جس کی طرف وہ خود بھی اس طرح اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں لکھتا ہوں کہ جب حالات کی کرنی ہو عکاسی
وگرنہ کیا تضیعِ وقت سے مجھ کو ہو دلچسپی؟

حالات کی یہی عکاسی ان کے پہلے مجموعہ کلام ''آسودگی اداس لمحوں کی'' میں نظر آتی ہے اور یہی ترجمانی ان کے دوسرے مجموعے ''جلتے دیئے احساس کے'' میں قاری کو دکھائی دے گی وہ ایک سلیم الفکر اور مخلص اہل قلم تھے۔ روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج ان کے فن کی خاصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں ایک تازگی کا احساس ہر جگہ ملتا ہے۔

میاں مظہر قیم مظہر کی شاعری کے نمایاں موضوعات ہیں دین، وطن اور انسانیت جو اقبال اور ادب اسلامی کی تحریک کے براہ راست اثرات کا نتیجہ ہیں، دینِ اسلام سے ان کی عقیدت و شیفتگی کی واضح مظہر ان کی وہ منظومات ہیں جو حمد و نعت اور دعا کے عنوان کے تحت موجود ہیں۔

ان کا ایک ایک شعر دیکھئے۔

کتنے ورق رقم ہوئے تعریف میں تری
کیا جانے اور کتنے ہی انبار چاہئیں
(حمد)

آئے جب طیبہ کا منظر سامنے
دیدہ و دل کو میں فرشِ رہ کروں
(نعت)

شہیروں پر میں اپنے ہوں نازاں بہت
میری پرواز کو اور افلاک دے
(دعا)

اس کے علاوہ ان کی غزل میں سے بھی ایسے اشعار آسانی سے منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ جن کے پس منظر میں اسلامی لفظیات ہی نہیں اسلامی فکر بھی کارفرما ہے۔ مثلاً

مل جائے تو پھر ہاتھ سے جانے نہ کبھی دیں
ایسا تو ثنا خوانِ ابو ذر نہیں کرتے

کسی بھی طور اُسے نسبت بتول نہیں
وہ چہرہ جس پہ ذرا بھی حیا کی دھول نہیں

آدمی وہ ہے فرشتوں سے عظیم
بے گنہ ہو جو گنہگاروں کے بیچ
تو رکھ نہ سکا رشتہ تسبیح کو قائم
اب دانے ترے ہاتھ میں کچھ کم ہیں تو ہوں گے
میں شہر خموشاں میں اذاں دینے چلا ہوں
مُردوں کو کوئی کیسے جگاتا ہے ذرا سوچ

مخدوم بنا بیٹھا ہے ہر خادمِ ملت
تو کس کے مقدر کا ستارہ ہے ذرا سوچ

اس سلسلے میں ان کے دو ہائیکو بھی قابلِ ذکر ہیں۔

حسینؑ ابن علی

وہ نیزے پر جو حسین کلی ہے
خدا کے رستے میں ہے کٹا سر
حسینؑ کا نعرہ جلی ہے

اور

حرم کعبہ

اک عالم بقعۂ نور
تیرے گھر کی شان کے آگے
کیا ہے جلوۂ طور؟

اقبال کے زیر اثر یہ رنگ اور دلکش پیکر تراشتا ہے مثلاً ان کی ایک تضمین کا یہ بند دیکھئے۔

سفینہ بھی ترا ہے اور یہ طوفان بھی تیرا
اگر ایقان تیرا ہے تو پھر امکان بھی تیرا
فقط عرفان تیرا ہی نہیں وجدان بھی تیرا
محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اور اسی اثر کے تحت یہ قطعہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

زندگی کا تذکرہ کیونکر کروں؟
ایک بے ساز و نوا ہے زندگی

ہے کبھی محکوم و بے بس اور کبھی
حاکم و فرماں روا ہے زندگی

وطنِ عزیز سے ان کی محبت و الفت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی قومی اور ملی نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایسی نظموں میں وہ اپنے قلم کے ذریعے وطن کی نظریاتی سرحدوں کی پاسبانی کا فریضہ ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک آزاد نظم ''محافظت'' کے چند مصرعے دیکھئے۔

مجھے تو صدمہ جو ہے تو یہ ہے
کہ اب بھی خلوت کدوں میں ویسے ہے آب رنگیں کا دور جاری
ہے مے گساروں کی بادہ خواری
ہے ناز نینوں کا رقص جاری
ستارِ الفت سے پھوٹتی ہیں سُریں علاقائی عصبیت کی
الاپے جاتا ہے راگ کوئی کدورتوں کے، عداوتوں کے
وطن کی مادر! میں مستعد ہوں، جو جی میں آئے تو آزما لے
تفنگ تھامے وطن کی سرحد کی پاسبانی میں کر رہا ہوں

حب وطن کا یہ رنگ ان کی غزل میں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے، منافقت سے دور ایک حق پرست انسان کی حیثیت سے وہ ارض وطن پر سیاست گروں کی چیرہ دستیوں سے نالاں نظر آتے ہیں، اور ان کا یہ درد ان کے لبوں تک آتے آتے یہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔

راہزن جن کے محافظ تھے کہاں تک پہنچے؟
ہم کہ ہر گام لٹے راہبروں کے ہوتے

اس قوم کا کیا ہو گا؟ جس قوم کی آزادی
پابندِ سلاسل ہو قرضوں کی غلامی سے

انسان دوستی دراصل دین ووطن سے وابستگی کے زیر اثر وسیع تناظر میں ایک تعمیری فکر ہے۔اس لئے کہ دینِ اسلام سے زیادہ انسان دوست کون سا دین ہوگا؟ اور وطنِ عزیز کہ اس کی بنیاد ہی فکرِ اسلام پر ہے وسیع تر عالمی امن وتہذیب ہی کا ترجمان ہے،مظہر قسیم مظہر کی شاعری میں دورِ حاضر کے انسان کے اجتماعی مسائل کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے،اخلاقی اقدار کی شکست کے نتیجے میں آج کے معاشرے میں زبوں حالی کا جو عمل جاری ہے،اس پر مظہر جیسے حساس شاعر کا دلِ دردمند تڑپ اٹھتا ہے اور وہ غزل کے پیکر میں اس سوز وگداز کو زیادہ کامیابی سے بیان کر دیتے ہیں۔چند شعر دیکھے۔

ستاروں کی طرف نظریں جما کر بیٹھنے والو!
کبھی سوچا زمیں کی کس کے ہاتھوں ہو حنا بندی؟

آنکھوں میں جل رہے ہیں جو احساس کے دیئے
مر کر بھی وہ نہ ہو سکیں بے نُور دوستو!

مانا کہ چلتے پھرتے ہیں جب تک ہیں دل رواں
جسموں کے جمگھٹے میں مگر زندہ کون ہے؟

اس دور کا ہر شخص ہی کشکول بکف ہے
جس کو نہ طلب ہو وہ سمندر نہیں ملتا

در بدر لے کر پھری ان کے شکم کی آتش
دیکھئے کتنے مہاجر ہیں غموں کے ہوتے

یہ تہمتوں کا ردِ عمل ہے کہ آج کل
ہر خندہ زن بھی شہر میں روتا دکھائی دے

روشنی تیرگی کی زد میں ہے
دن بھی نکلا ہے شام کی صورت

وہ ایک صاحب ہمت شخص تھے۔حوصلہ ہارنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔چنانچہ سفرِ حیات کے ہر موڑ پر وہ ایک نئے عزم اور نئے شوق کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یوں زندگی کی ظلمتوں میں حقیقت پسندی اور معروضیت کے پہلو روشن کرتے نظر آتے ہیں مثلاً۔

ردائے شوق کو اوڑھے پھروں گا ہر جانب
ہزار منزلیں کھو کر بھی میں ملول نہیں

زخم یوں آج جگمگاتے ہیں
مات کھا جائے کہکشاں شاید

نغمۂ دل ہے سوزِ دل کا مآل
رشتۂ غم خوشی سے ملتا ہے

اک کچوکے پر ہے مظہر مضطرب
پھول ہیں خنداں مگر خاروں کے بیچ

کیا اشتیاق مجھ کو ہے منزل کی دید کا
رک جاؤں بھی تو راستہ چلتا دکھائی دے

میرے رونے پہ جہاں والے ہنسے ہیں برسوں
آج ہنس ہنس کے رُلا دوں تو بتا کیسی رہے؟

ہم محفل گرمانے آئے
آنسو پونچھ کے دیدۂ تر سے

حسن کامل جو سمجھتے ہیں ہمیشہ خود کو
آئینہ ان کو دکھا دوں تو بتا کیسی رہے؟

جذبۂ شوق سے نکلتی ہے
بوئے گل سے کلام کی صورت

تماشا گھر کے جلنے کا جو اُس نے دیکھنا چاہا
بصد شوقِ تمنا ہم نے اپنے گھر جلائے ہیں

دھوپ کی لہریں کس شوخی سے بول رہی ہیں جھوٹ
یہ اک پیاسا صحرا ہے جو دریا لگتا ہے

غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے اور اگرچہ جدید غزل پوری زندگی کی عکاسی ہے لیکن اس عمومیت کے باوجود حسن وعشق کا بیاں آج بھی غزل کا بنیادی موضوع رہے گا۔ مظہر صاحب کے یہ اشعار خالص غزل کے اشعار قرار دیئے جائیں گے اور انہیں با آسانی غزل کے بہترین انتخاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

شرابِ جوانی میں بھی کیا نشہ ہے؟
پئے بن ہی آنکھیں ہیں مخمور دیکھو

اک دوجے پر چاہت کا اظہار نہ ہم نے ہونے دیا
جھوٹ موٹ کی نفرت کر کے دونوں نے فنکاری کی
تو نے لمحوں میں سمٹتی ہوئی صدیاں دیکھیں
دیکھ آفاق پہ پھیلا ہے یہ لمحہ کیسے؟

آفاق پہ پھیلا ہوا یہ لمحہ دراصل روشنی کی علامت ہے جو احساس کے جلتے ہوئے دیوں سے عبارت ہے۔ مظہر قسیم مظہر کے "جلتے دیئے احساس کے" شر کی ظلمتوں کے خلاف ایک جہاد اور نیکی اور صداقت کی روشنیوں کے ہمہ گیر پیغام کے امین ہیں۔ آج مظہر صاحب اگرچہ ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ان کے "جلتے دیئے احساس کے" مر کر بھی بے نور نہیں، بلکہ اپنی پوری آب وتاب سے روشن ہیں اور مجھے توقع ہے کہ ان کی روشنی دیر تک فضاؤں کو روشن وتابناک رکھے گی۔ انشاءاللہ

☆☆☆☆☆☆

کشکول ہلال

حضرت ہلال جعفریؒ کی شخصیت میں جو سادگی، انکسار، تواضع، خلوص اور سوز و گداز تھا۔ وہ ان کے جذبہ عشقِ رسول کی بدولت ہے۔ جس میں وہ سرتا سر ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قسامِ ازل نے مدحتِ رسول کی نعمت عظمیٰ سے بھی انہیں بہرہ یاب کر دیا اور یوں وہ ان چند خوش نصیب اہلِ سخن میں شامل ہو گئے، جن کی زندگی کا مقصد ہی حبیب خدا ﷺ کی توصیف و مدحت کا فروغ و اشاعت ہے۔ دوسرے لفظوں میں نعت گوئی اور نعت خوانی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا کہ وہ نعت کہتے تھے، نعت پڑھتے تھے اور نعت لکھتے تھے۔ انہوں نے ساری عمر دینی ادب کے سوا کسی اور رنگ سے اپنے قلم کو آشنا نہیں کیا۔ بزمِ حسانؓ کی صورت میں کوئی ربع صدی تک وہ مدینۃ الاولیاء ملتان میں نعتیہ محافل کا انعقاد کرتے رہے۔ اور کچھ عرصے اسلام آباد کے کوہساروں میں حمد و نعت و منقبت کے چراغ روشن کرتے۔ وہ جب کسی محفل میں اپنے مخصوص پر گداز ترنم کے ساتھ جذب و مستی میں ڈوب کر اپنا نعتیہ کلام عطا کرتے۔ سامعین پر ایک سرشاری سی طاری کر دیتے۔ گویا وہ خود بھی عشقِ رسول کے سوز سے اپنی آنکھوں کو باوضو رکھتے اور سامعین کو بھی اس کیفیت میں شریک کر لیتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

''ہلالِ حرم'' ان کی نعتوں کا پہلا مجموعہ تھا جو کافی عرصہ پہلے شائع ہوا تھا اور ادبی حلقوں میں اسے خوب پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ''معراجِ مصطفیٰ''۔ ''جانِ رحمت''۔ ''طلوعِ سحر'' اور ''کاسہ ہلال'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں ان کی نعتیہ غزلوں اور مختلف تضمینوں کے علاوہ نعتیہ قطعات شامل ہیں، ان کی نعت سراپا اخلاص، مجسم عقیدت اور سراسر محبت ہے اور یہ فکر کی پاکیزگی، جذبے کی صداقت اور بیان کے والہانہ پن سے عبارت ہے۔ ان کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ ساتھ ایک بانکپن اور رعنائی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اثر کے اعتبار سے دلوں میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ مطلع تو کئی اہلِ درد کے دلوں پر قیامت ڈھا چکا ہے۔

بیٹھا ہوں لئے دردِ محمدؐ کا جگر میں
اللہ کی رحمت سے ہے سب کچھ مرے گھر میں

اور اسی طرح ان کا یہ شعر بھی ہمارے نعتیہ ادب میں انتہائی مشہور و مقبول ہے۔

جب لوٹ کے آؤں گا مدینے کے سفر سے
میں کیسا لگوں گا مرا گھر کیسا لگے گا؟

ان کی نعت گوئی کی ایک خصوصیت تخلص کا پر معنی استعمال بھی ہے، تقریباً اپنے ہر مقطعے میں انہوں نے اپنے تخلص ہلال کو اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اس کی معنویت دوچند ہو گئی ہے۔ مثلاً

چمک دمک میں یہ ماہِ تمام ہو جائے
ہلال کو جو ترے آستاں کی دھول ملے

کچھ عرصہ پہلے ان کی نعتیہ تضامین کا ایک ضخیم مجموعہ ''کشکول ہلال'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ جو ان کا چھٹا مجموعہ کلام ہے۔ اس کتاب میں ہلال صاحب نے تقریباً ایک سو قدیم و جدید شعرا کی نعتوں پر اپنی تضامین پیش کی ہیں۔ جن میں حضرت امیر خسروؒ۔ سیماب اکبرآبادی، بیدم وارثی، جگر مرادآبادی، استاد قمر جلالوی، حافظ مظہر الدین، راغب مرادآبادی اور حفیظ تائب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب کے آغاز میں پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا ایک نہایت جامع مقدمہ ''کشکول ہلال ایک وقیع کارنامہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کے علاوہ حضرت قمر رعینی جناب نور احمد میرٹھی، پیر سید نصیر الدین نصیر، جناب بشیر حسین ناظم اور سید ناصر زیدی ایسے معروف اور ممتاز اہل قلم کے گراں قدر تاثرات ہیں۔

تضمین ایک مشکل اور نازک فن ہے۔ اس لئے کہ اس میں تضمین نگار کو کسی دوسرے شاعر کے اشعار پر اپنے مصرعے اس چابکدستی سے چسپاں کرنا ہوتے ہیں کہ اس پیوند کاری میں ہمیں دوئی کا احساس نہ ہو۔ اس سلسلے میں ذرا سی بے احتیاطی بنا بنایا سارا کام بگاڑ سکتی ہے، تضمین نگار کو اپنے خاص اسلوب سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو کر دوسرے کے رنگ کو اپنانا پڑتا ہے۔ گویا وہ ایثار سے کام لیتا ہے پھر اس کے علاوہ اس کے مزاج میں زبردست تحمل اور استقلال بھی ہونا چاہیے کہ اسے دوسروں کی موج کے ساتھ ساتھ بہنا پڑتا ہے اور دوسروں کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنا پڑتا ہے اور یہ ریاضت عام طور پر صرف ایک شعر کے لئے نہیں، بلکہ زیر تضمین پوری نظم کے ہر شعر کے لئے

کرنا پڑتی ہے۔اس سے آپ شاعر کی مشکلات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور جب معاملہ ہلال صاحب کی طرح ایک سے بڑھ کر کوئی ایک سو شعرا کا ہو تو اس کی نزاکت بھی سوگنا بڑھ جاتی ہے۔

ہلال صاحب نے جن ایک سو قدیم وجدید شعرا کی نعتوں کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے ان میں سے بیشتر مسلم الثبوت اور قادر الکلام استاد ہیں اور اپنے خاص مزاج اور خاص رنگ کے مالک ہیں۔پھر ان کی یہ نعتیں رنگا رنگ زمینوں میں ہیں، مختلف بحور، مختلف اسالیب اور مختلف لفظیات کی حامل، اس صورت میں ہر شاعر کے کلام کی تضمین سے کامیابی اور کامرانی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہلال صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔گویا ایک بحر ذخار ہے۔جس کی ایک ایک لہر اور ایک ایک قطرے کی انہوں نے بڑی مہارت سے غواصی کی ہے اور ہر بار وہ سخن کے گوہر نابدار لے کر لوٹے ہیں، درحقیقت یہ حیرت ناک کامیابی اور رشک انگیز سرخروئی ان کے سینے میں موجزن عشقِ رسول کی بدولت ہے، ہلال کو درِ سلطانِ دوعالمؐ سے نسبت ہے، چنانچہ وہ سخن کی گدائی کے لئے بھی خواجہ کونینؐ کے حضور کشکول بکف حاضر ہوتے ہیں اور اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ منبعِ جود وسخا، شہنشاہِ ہر دوسرا اپنی خیراتِ کرم سے ان کا کشکول نہ بھریں۔چنانچہ یہ تضامین دراصل ان کے ممدوح کی چشمِ رحمت کا فیض ہیں، اس بے بہا دین اور اس گراں مایہ عطا پر وہ جس قدر ناز کریں کم ہے۔

آیئے لفظ ومعنی کے اس کشکول کے سدا بہار سرمائے میں سے کچھ چمکتے اور کھنکتے ہوئے روپہلے اور سنہرے سکے ملاحظہ کریں، یعنی ان کی تضامین کے کچھ نمونے دیکھیں۔

تیرے در کی بھیک کا اک ایک ذرہ نور کا
دور سے کاسہ بکف آیا ہے منگتا نور کا
تُو ہے داتا نور کا تیرا خزانہ نور کا
میں گدا تو بادشاہ، بھر دے پیالہ نور کا
نور دن دونا ترا دے ڈال صدقہ نور کا

(اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ)

تربت رہے آباد پسِ مرگ الٰہی
رہ جاؤں نہ ناشاد پسِ مرگ الٰہی
کیجو مری امداد پسِ مرگ الٰہی
مٹی نہ ہو برباد پسِ مرگ الٰہی!
جب خاک اڑے میری مدینے کی ہوا ہو

(مولانا حسن رضا خاں بریلویؒ)

رونق وقت بنوں زینتِ ویرانہ بنوں
غم کی تصویر بنوں ہجر کا افسانہ بنوں
گردشِ جام بنوں جنبشِ پیمانہ بنوں
مست و شیدا بنوں رسوا بنوں دیوانہ بنوں
عشق کہتا ہے ترے عشق میں کیا کیا نہ بنوں؟

(بیدم وارثیؒ)

منزل سے آشنا نہیں قدموں میں دم نہیں
خدشہ کوئی ذرا بھی خدا کی قسم نہیں
اب خضر بھی ملے نہ ملے اس کا غم نہیں
اب میری زندگی میں کوئی پیچ وغم نہیں
راس آ گیا ہے مجھ کو دیارِ غم رسولؐ

(عزیز حاصل پوریؒ)

صبح ازل ہے آپ کا جلوہ شام ابد کی ضو پیشانی
آپ کی صورت جلوہ یزداں آپ کی سیرت ہے لاثانی
آپ کی رحمت، رحمتِ رب ہے آپ کا دم ہے رب کی نشانی
صبح ازل ہے ان کی تجلی شامِ ابد ان کی نورانی
آپ موخر آپ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

(حافظ مظہر الدینؒ)

ہر تنکے پر ہر ذرے پر ہر بجلی پر ہر بے پر پر
ہر منزل پر ہر راہی پر ہر کجرو پر پر رہبر پر
دیدۂ تر پر زخمی جگر پر دل کی تڑپ پر قلب وجگر پر
شام وسحر پر شمس وقمر پر علم و ہنر پر فکر ونظر پر
سب پر اس کا سایۂ داماں صلی اللہ علیہ وسلم

(عاصی کرنالی)

آلِ نبیؐ کا غم بھی مسرت صفات ہے
ان پر درود پڑھنا غموں سے نجات ہے
آلِ نبیؐ نجات دہِ حادثات ہے
آلِ نبیؐ سفینۂ بحرِ حیات ہے
اصحاب ہیں نجوم سرِ آسمانِ خیر

(حفیظ تائب)

غرض نعتیہ تضامین کے اس خزینہ پر انوار کے کس کس گوہرِ منور اور اس حدیقۂ پر بہار کے کس کس گل معطر سے چشم و دل کو سیراب کیا جائے؟ یہ مجموعہ مدحت وعقیدت ہر لحاظ سے سرمایہ ادب و فن ہے کہ اس میں متعدد عاشقانِ رسولؐ کے دوش بدوش خود ہلال کی چشم آبدار کی نمی اور اس کے جگر کے خون کی سرخی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کو ایک اعزاز اور اختصاص یہ بھی حاصل ہے کہ نعتیہ تضامین کا اُردو میں غالباً یہ پہلا مجموعہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اقبال کا تصورِ شاہین

کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا جائے تو تین بڑے ادوار ہمارے سامنے آئے ہیں۔ شباب۔ پختہ سالی اور آخرِ عمر لیکن ان تینوں ادوار کی شاعری میں یہ بات حیرت انگیز حد تک مشترک ہے کہ ان کا مخاطب نوجوان ہے اور موضوعِ سخن زیادہ تر شباب اور اُس کی مختلف کیفیات ہیں۔ نوجوانوں اور زمانۂ شباب سے اقبال کی یہ دلچسپی قرینِ فطرت ہے کہ دورِ شباب ہی انسانی زندگی کا زریں دور ہوتا ہے اور کسی بھی انقلاب کی عملی کامیابی کا سہرا بیشتر نوجوانوں ہی کے سر ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن و دل نئے افکار کو سن رسیدہ لوگوں کے مقابلے میں جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو تین جدید تصورات دیئے۔ خودی، فقر اور عشق، دوسرے لفظوں میں انہوں نے ان تین الفاظ کو نئے معانی اور مفاہیم عطا کئے۔ ان کے نزدیک خودی سے مراد عظمتِ انسانی، فقر سے مراد سیر چشمی اور بے نیازی اور عشق سے مراد گرمی دل اور جذبہ کامل ہے۔ ان تینوں تصورات کو اقبال ایک مثالی نوجوان کی شخصیت میں مجتمع دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے وہ شاہین کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ شاہین ایک سفید فام شکاری پرندہ ہے۔ جس میں کچھ ایسی اعلیٰ صفات ہیں جو عام پرندوں میں نہیں۔ مثلاً وہ تیز بیں اور بلند پرواز ہے۔ کہیں آشیانہ بنا کر نہیں رہتا۔ خوددار ہے اپنا رزق خود شکار کر کے کھاتا ہے اور سخت کوش اور سخت جان ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر اُسے پرندوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں جن تصورات نے علامتوں کا پیکر اختیار کیا۔ ان میں شاہین کا تصور ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر جب یورپ گئے۔ تو ایک عرصے تک انگلستان اور جرمنی میں مقیم رہے اور ان ملکوں کے فکر و فلسفہ کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ خاص طور پر جرمنی کے قیام کے دوران میں انہوں نے جن فکری اثرات کو قبول کیا۔ ان میں معروف جرمن فلسفی

نطشے کا فلسفۂ قوت وزندگی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔اس کے علاوہ جرمن قوم کی فعالیت اور بلند نظری اور خودشناسی اور خود اعتمادی نے فکرِ اقبال پر گہرے اثرات چھوڑے اور انہی دوررس اثرات کی یادگار وہ فلک سیر پرندہ بھی ہے جسے شاہین کہتے ہیں جو جرمنی کا قومی نشان بھی رہا، چنانچہ یہ بلند پرواز طائر کہیں شاہین اور کہیں شہباز کی صورت میں اقبال کے آسمانِ شاعری پر ہمیشہ محوِ پرواز نظر آتا ہے۔

اس بلند پرواز پرندے کی پہلی جھلک ہمیں اقبال کی شاعری کے اولین دور کی ایک نظم ''مرغ ہوا'' کی صورت میں نظر آتی ہے۔

اک مرغِ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے
پردار اگر تو ہے تو کیا میں نہیں پردار؟
گر تو ہے ہوا گیر تو ہوں میں بھی ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحب پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائل پندار
مجروح حمیت جو ہوئی مرغِ ہوا کی
یوں کہنے لگا سُن کے یہ گفتارِ دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تری پرواز کی لیکن سرِ دیوار
واقف نہیں تو ہمتِ مرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیں ہے، انہیں گردوں سے سروکار

اس طرح پہلی بار اقبال نے عام پرندوں کے مقابلے میں مرغِ ہوا کہہ کر شاہین کا یہ تعارف کرایا ہے کہ وہ خاک نشین ہونے کی بجائے آسمانوں کی وسیع وعریض فضاؤں میں سرگرم پرواز ہے۔ جرمن قوم نے شاہین کو اپنا قومی نشان اس لئے قرار دیا تھا کہ اُس کی نظر میں شاہین کی قوت،

تیزی، وسعتِ نگاہ، دور بینی اور بلند پروازی اور شجاعت ایسی عظیم خصوصیات ہیں جو کامیاب انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔لیکن اقبال کے تصورِ شاہین اور یورپ کے تصورِ شاہین میں یہ فرق ہے کہ اقبال نے شاہین کی مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اسے فقر ودرویشی اور خودداری وبے نیازی کی اعلیٰ صفات سے بھی متصف کیا ہے اور یوں اسے مسلمان نوجوانوں کے لئے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے ان کی نظم ''شاہین'' اس کا بہترین ثبوت ہے۔شاہین کی زبانی اقبال فرماتے ہیں۔

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیمارئ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

پرندوں کی دُنیا کے اس درویش بادشاہ پرندے کی زبانی لہو گرم رکھنے کا جس انداز سے ذکر آیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نظامِ حیات میں خونِ گرم ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

لہو یا خونِ گرم اقبال کا وہ مجسم تصور ہے جو اکثر ہمیں ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔لہو میں گرمی بھی ہے اور روانی بھی یعنی حرارت وحرکت جو زندگی کی علامت ہے اور یہی اقبال کی شاعری کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وَسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا اُس کو
نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غمِ افلاس

زندہ رہنے کی جد وجہد کے لئے ہمت وجواں مردی کی ضرورت ہے اور ہمت وجواں مردی خون گرم کا کرشمہ ہے یہ خون گرم حیاتِ انسانی کو جہاں حوصلہ وعزم بخشتا ہے۔ وہاں روحانی بلندیوں سے بھی سرفراز کرتا ہے۔چنانچہ اقبال کا نوجوان جہاں باہمت، جواں مرد بہادر اور سخت کوش ہے۔وہاں وہ اُن روحانی بلندیوں پر بھی فائز ہے۔جن سے مغرب کی مادہ پرست اقوام محروم ہیں۔شاہین سے اقبال کے خطاب کا یہ انداز دیکھئے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حُور
کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تو

اور

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اس طرح اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کو بلند پروازی کے ساتھ ساتھ فقر وغنا اور بے نیازی کی تعلیم دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ نوجوانانِ اسلام عزت وحمیت اور خودداری کے بے بہا جواہر سے آراستہ ہوں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں، پر اسرارِ شہنشاہی

اے طاہر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبال کا شاہین یا دوسرے لفظوں میں نوجوان جہاں ہمت وقوت، شجاعت وبسالت، بلند پروازی وسخت کوشی اور تیز نگاہی کی صفات رکھتا ہے۔ وہاں وہ فقر درویشی اور مکروہات دنیا سے لاتعلقی کی اعلیٰ صفات سے بھی مزین ہے۔ اس کی آسماں پرواز دراصل اس کی روحانی پرواز ہے۔ جہاں وہ سرور جاودانی اور علوسرمدی کی نئی نئی کیفیات سے آشنا ہوتا ہے۔ مثلاً

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب وگل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹی نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ وخم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

اقبال کا شاہین اپنے سفلی مقابل کرگس سے سراسر مختلف ہے۔ اس لئے کہ شاہین فقر وغنا اور خودی کی بلندیوں پر فائز ہے۔ جبکہ کرگس مردار خوری کی پستیوں میں ذلت وخواری کی زندگی پر مطمئن ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

شاہین اور کرگس کے حوالے سے اقبال نے زندگی کے دو متضاد پہلوؤں کا موازنہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ کرگس کی مادہ پرست اور شکم سیر زندگی کو وہ ذلت وخواری سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی مادہ پرستی اور پیٹ کی غلامی ہے۔ جو قوموں کو نہ صرف روحانی طور پر بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی ضعیف

سے ضعیف تر بنا دیتی ہے۔ جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ ایک تمثیل سے اقبال اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھوکا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ ترو تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مُرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

شاہین کی مثالی علامت پیش کر کے اقبال اپنے نوجوانوں میں حقیقی اسلامی کردار کی عملی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن صورتِ حال جب اس کے برعکس دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

چنانچہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ دعا آجاتی ہے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدا یا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

شاہیں کے بال و پر دراصل بلند نگاہی ۔قوت وحرکت، سخت کوشی، فقر وغنا اور غیرت وحمیت کی وہ اعلیٰ صفات ہیں ۔جن کے ذریعے وہ آسمانی فضاؤں میں بے خوف وخطر محوِ پرواز رہ سکتا ہے ۔اقبال چاہتے ہیں کہ ان کی قوم کے شاہینوں میں بھی یہ عظیم خصوصیات پیدا ہوں ۔وہ بلند نگاہ ہوں ۔یعنی انکے مقاصد عظیم ہوں ۔قوت وحرکت سے معمور ہوں یعنی جمود اور تعطل کا شکار ہونے کی بجائے وہ ہر دم رواں دواں ہوں ۔فقر وغنا ان کا سرمایہ ہو یعنی اپنے دست وبازو پر انہیں اعتماد ہو اور وہ رزق حلال کمائیں اور سخت کوشی ان کا امتیاز ہو۔یعنی وہ تن آسانی اور آرام پسندی کی بجائے سخت محنت ومشقت کو اپنا وطیرہ بنائیں کہ صرف اِسی طرح زندگی کے اعلیٰ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں ۔

(۱۹۷۱ء)

☆☆☆☆☆☆

اقبال کا پیامِ خودی

شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے افکارِ عالیہ میں خودی کا نظریہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور علامہ کے تمام افکار اسی محور کے گرد گردش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔وہ اولین شاعر ہیں جنہوں نے لفظِ ''خودی'' کا نیا مفہوم متعین کیا ۔اور اس لفظ کو نئے معانی سے آشنا کیا ۔اس لئے کہ ان سے پہلے یہ لفظ عام طور پر تکبر اور غرور کے معنوں میں مستعمل تھا ۔لیکن اقبال کے یہاں خودی سے مراد احساسِ ذات، عرفانِ ذات اور اظہارِ ذات ہے ۔

ان کے نزدیک کائنات کا ہر ذرہ اپنی نمود کے لئے کوشاں ہے اور فرد اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لا کر اپنے آپ کو کمال کی انتہائی بلندیوں پر فائز کرنے میں مصروفِ عمل ہے ۔گویا ہر ذرہ نشہ خودی میں سرشار ہے ۔

خودی ایک ایسا جوہر ہے جو زندگی کی بقا اور استحکام کے لئے ضروری ہے ۔اس جوہر سے جو بھی عاری ہوگا ۔فنا اس کا مقدر ہوگی ۔یہی خودی ہے جو حرکت وعمل کی علامت ہے ۔زندگی کا راز ہے اور کائنات کی بیداری ہے ۔زندگی کی اصل حقیقت کا عرفان خودی ہی کے ذریعے ممکن ہے ۔اس لئے کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه جس نے اپنے نفس کو پہچانا ۔اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال فرد کو اپنے آپ میں گم ہو کر زندگی کی حقیقت جاننے کی تلقین کرتے ہیں ۔

اقبال ہر اس عمل کے خلاف ہیں جس میں خودی کی موت ہو ۔یہاں تک کہ وہ ایسی بادشاہی کے بھی حق میں نہیں ۔جو خودی سے محروم ہو ۔وہ اس امیری سے جس میں خودی کو بیچا جائے اس فقیری کو افضل اور بہتر سمجھتے ہیں ۔جہاں انسان ضمیر کی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے ۔خودی کا یہ عرفان عشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ۔عشق عمل کا دوسرا نام ہے جس کے دم سے زندگی میں نغمگی ہے ۔جو نورِ حیات بھی ہے اور نارِ حیات بھی ۔عشق جو ایمان کا جزوِ اعظم ہے جس کے دم سے کفر

مسلمانی اور نہ ہونے سے مسلمانی بھی کفر سے کم نہیں۔ کہیں یہ خلیلؑ اللہ کا صدق بن کر ابھرتا ہے۔ کہیں حسینؓ کا صبر بن کر نمایاں ہوتا ہے اور کہیں زندگی کے معرکے میں بدروحنین کی علامت ہے۔

انسانی خودی اگر علم کے دم سے غیرتِ جبریلؑ ہے تو عشق کے طفیل صوراسرافیلؑ کا فریضہ انجام دیتی ہے اور جب یہ عشق غلاموں کو خودشناسی اور خودآگاہی کے آداب سے آشنا کرتا ہے تو ان پر شہنشاہی کے اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ عطارؒ، رومیؒ، رازیؒ اور غزالیؒ کو عشق ہی کی بدولت آہِ سحرگاہی کی بیش بہا نعمت حاصل ہوتی ہے اور اسی کے طفیل مردِ فقیر کی ذات میں وہ بوئے اسداللہی در آتی ہے جو اُسے دارا اور سکندر ایسے پرجلال اور پرشکوہ بادشاہوں سے ارفع و اعلیٰ ایک ایسا مقام بلند عطا کرتی ہے کہ حق گوئی اور بے خوفی اس کی زندگی کا آئین اور دستور بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا سینہ ایمان و یقین کی لازوال روشنی سے منور ہوتا ہے اور ایمان و یقین کی یہ لازوال روشنی خودی کے عرفان کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

خودی کا عرفان ہی مردِ مومن کو مقامِ بادشاہی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ صاحبِ خودی کے سامنے ایک دنیا جھک جاتی ہے۔ زمین اور آسمان اس شیرِ مولا کے شکار ہوتے ہیں۔ صاحبِ خودی بے پناہ قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ ہر شے اس کے اشارے پر سرگرمِ عمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک نگاہ سے تقدیریں بدل دیتا ہے۔ یہ صاحبِ خودی، اقبال کا وہ مردِ مومن ہے جسے وہ عقل کی منزل اور عشق کا حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ حلقۂ آفاق میں گرمئ محفل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کی مشکل کشائی کے علاوہ دنیا کی تعمیر و تزئین کا اہم فریضہ بھی اس مردِ مومن کے سپرد ہے۔ مردِ مومن کی خرد کے ساتھ اس کا دل اور اس کی نگاہ بھی مسلمان ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دل و نگاہ کا ایمان لانا خرد کے ایمان لانے سے زیادہ ضروری ہے۔ اقبال کے نزدیک مردِ مومن کی شخصیت ایسی بوقلموں ہوتی ہے کہ ہر لحظہ اس کے کردار اور گفتار میں ایک نئی آن اور ایک نئی شان نظر آتی ہے۔

بندہ مومن کو یہ مقام اس کی خودی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ خودی انسان کا وہ جوہرِ اصلی ہے جس کی بنا پر اُسے کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا شرف عطا ہوا ہے۔ زمین، آسمان، کرسی اور عرش غرض ساری خدائی خودی کی زد میں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان نائب خدا کے منصب پر فائز ہوتا ہے اور جہاں تقدیرِ الٰہی بھی رضائے انسان کے تابع ہوجاتی ہے۔

خودی کے ارتقاء کے تین درجے ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی اور زندگی کیا ہے؟ اپنی خودی کا احساس، اپنے ماحول کا علم اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنا اور ماحول کا علم اور معرفتِ الٰہی تبھی حاصل ہوسکتے ہیں جب خودی کا احساس ہو۔ اس لئے احساسِ خودی زندگی کا مقصدِ اولین بن جاتا ہے۔

خودی کے بیش قیمت جوہر کی حفاظت ہی انسان کو گراں بہا بناتی ہے اس لئے کہ جس طرح موتی کی قدر و قیمت اس کی آب و تاب سے ہے اسی طرح انسان کی قدر و منزلت اس کی خودی سے ہے اور یہی عرفانِ خودی اور حفظِ خودی اسلام کی تعلیم ہے۔ اسی لئے اقبال مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ خود کو پہچانو اور اپنے آپ کو اقوامِ عالم میں سربلند اور فاتح قوم کی حیثیت سے برقرار رکھو۔ اسلئے کہ انسانی زندگی کا مقصد تسخیرِ کائنات ہے اور تسخیرِ کائنات کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اپنی خداداد اعلیٰ صفات، تخلیقی صلاحیتوں اور خفتہ قوئی کو پہچانیں۔ انہیں بیدار کر کے کام میں لائیں اور کارزارِ حیات میں انہیں آزمائیں۔ انہی خفتہ قوتوں کی پہچان ہی خودی ہے اور جو قومیں اس جوہر سے صحیح معنوں میں کام لیتی ہیں۔ انہیں عمرِ جاوداں حاصل ہوجاتی ہے۔

اقبال کا نظریۂ خودی درحقیقت عظمتِ آدمؑ کے عرفان کا دوسرا نام ہے اس لئے کہ انسان ہی خلاصۂ کائنات ہے اور یہ کائنات اس کے لئے پیدا کی گئی ہے اور یہ مقامِ محمود انسان کو اُسی وقت نصیب ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے قلب کو اس حد تک وسیع کرے کہ یہ کائنات اس کی وسعتوں اور پہنائیوں میں سماجائے۔ اور وہ دنیاوی طور پر اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوتے ہوئے بھی اُن باتوں سے بلند رہے جو اُسے اس کے مقصدِ تخلیق سے غافل کرتی ہیں۔ خودی کی یہ تربیت اور نشوونما کا عمل عشق کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر خودی آئینہ ہے تو عشق اس کا جوہر اور اگر خودی پھول ہے تو عشق اس کی خوشبو۔ خودی کا راز لاالٰہ الااللہ یعنی توحید میں پنہاں ہے۔ اور صاحبِ خودی توحید پرست ہونے کی بنا پر ہی زمانے میں منفرد اور یگانہ نظر آتا ہے۔ کائنات کی رزم گاہِ خیر و شر میں ہر وہ شے جو خودی کو مستحکم کرتی ہے خیر ہے اور جو اسے ضعیف کرتی ہے وہ شر ہے اور خیر و شر کے اس معرکے کو خودی کی تیغِ آبدار ہی سے جیتا جاسکتا ہے۔

(۱۹۷۱ء)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے

اقبال اُن چند بڑے شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کا تمام کلام ایک پیغام ہے۔ان کے فکر وفن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ''کیا ہے؟'' کی بجائے ''کیا ہونا چاہئے؟'' کے قائل ہیں۔گویا وہ حال سے زیادہ مستقبل کے شاعر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر تخاطب اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں نئی نسل یعنی نوجوانوں سے ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ نوجوان ہی کل کے پاسبان ہیں اور قوم کا مستقبل انہی سے عبارت ہے۔

اقبال ایک انقلابی مفکر تھے اور اسی لئے ان کا نظریہ حیات بھی انقلابی تھا۔وہ انقلاب کی کشمکش سے معمور زندگی کو قوموں کی بقا کی ضمانت اور انقلاب سے تہی زندگی کو موت کا پیغام سمجھتے تھے۔چنانچہ فرماتے ہیں۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

یہ ذوقِ انقلاب کسی وقتی جذباتیت کا نتیجہ نہیں بلکہ ندرتِ فکر وعمل کا ثمر ہے اور اسی کے ذریعے اپنی دنیا آپ تخلیق ہوتی ہے اور یہ ندرتِ فکر وعمل انسان کی فطرت میں ہے۔کہ اس کی روح میں سکون وجمود کی جگہ ایک تغیر وحرکت موجود ہے۔وہ کہتے ہیں۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

دوسرے لفظوں میں اقبال کے نزدیک زندگی کی تعمیر کے لئے قوتِ عمل بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد گویا اقبال زندگی میں کمزوری یا ضعف کی بجائے طاقت اور قوت کے قائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر آرزوؤں اور اُمیدوں کا مرکز بزرگوں کی بجائے نوجوان ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ نوجوانی عمر کا وہ حصہ ہے جس میں انسان بہترین جسمانی اور ذہنی قوتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔اس کے لہو میں طغیانی اور دل میں جوش و جولانی

ہوتی ہے۔ان کے نزدیک

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

یہی سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنے کی کیفیت ہی ہے جو نوجوانوں میں عقابی روح کو بیدار کرتی ہے۔اور جب یہ عقابی روح بیدار ہوتی ہے تو انہیں اپنی منزلِ مقصود انتہائی بلندیوں پر نظر آتی ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اقبال ایسے ہی صاحب خودی جوانوں سے مخاطب ہیں۔انہیں تعمیر مستقبل کے لئے انہی کے زورِ بازو پر بھروسہ ہے تو کہتے ہیں۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا

نوجوانوں سے اقبال کے گہرے تعلق کو ان نظموں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔جو انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں بچوں اور نوعمروں کے لئے لکھیں۔مثلاً پہاڑ اور گلہری۔مکڑا اور مکھی۔ایک گائے اور بکری۔ہمدردی۔بچے کی دعا۔ماں کا خواب اور پرندے کی فریاد۔ان نظموں میں بھی اقبال نے نئی نسل کو زندگی کی اعلیٰ اقدار کی تعلیم دی ہے اور یہی وہ اقدارِ حیات ہیں جو نوجوانوں میں آگے چل کر عزم وہمت کا سبب بنتی ہیں۔یہ عزم وہمت ان کی شاعری میں کہیں خودی

کی صورت میں جلوہ گر ہے کہیں سوزِ جگر اور عشق و نظر کے نام سے موسوم ہے اور کہیں اسے سرمایہ حیات کہا گیا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کے نوجوانوں کو پیغام دیتے ہوئے وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوزے روشن ہیں امتوں کے چراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

ایک اور مقام پر نژادِ نو سے یوں مخاطب ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کے نزدیک اس کے مخاطب یہی نوجوان ہیں جنہیں وہ ستاروں سے آگے جہانوں کی تسخیر کے اہل سمجھتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یا ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

انہی جوانوں کو وہ شاہین کے نام سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور انہی جوانوں کے لئے وہ آہِ سحر اور نورِ بصیرت کی یوں دعا کرتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

(۱۹۷۲ء)

☆☆☆☆☆☆

اقبال خطوط کے آئینے میں

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان اپنی ذات کے بارے میں جن باتوں کا عام لوگوں کے سامنے اظہار کرنے سے ہچکچاتا ہے، انہیں اپنے مخصوص احباب کے سامنے بے جھجک بیان کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین اور سوانح نگاروں کی اکثریت مشاہیر کے نجی خطوط کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اس لئے کہ اس طرح انہیں متعلقہ شخص کے بارے میں کچھ ایسی داخلی شہادتیں مل جاتی ہیں جو دوسرے ماخذوں سے زیادہ قابل اعتماد ہیں حقیقت یہ ہے کہ جب سے تحریر وجود میں آئی ہے مکتوب نویسی بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ خط کو عام طور پر نصف ملاقات کہا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں خط بالمشافہ ملاقات کا قائمقام ہوتا ہے لیکن بعض اوقات خط کی حیثیت نصف ملاقات سے بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ لکھنے والا خط میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھ جاتا ہے جنہیں بالمشافہ ملاقات میں وہ بیان نہیں کر سکتا۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق

''خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ بعض اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔''

گویا خط ذات کا عکس ہوتا ہے اسے شخصیت کا بے تکلف اظہار بھی کہا جا سکتا ہے چنانچہ خطوط کسی شخصیت کی سوانح نگاری کے بہترین ماخذ کا کام دیتے ہیں کیونکہ ان کی حیثیت آپ بیتی کی سی ہوتی ہے۔ علامہ اقبال خطوط کی اس ادبی اہمیت کا اظہار فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے

کے شعراء کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے''۔

علامہ اقبال کے اس ارشاد کی صداقت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات خطوط میں مکتوب نگار کی ذات اور شخصیت کے وہ چھپے گوشے بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مکتوب نگار کے ذاتی خیالات وعقائد کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ یہ بات علمی اور ادبی مشاہیر کے خطوط کے بارے میں زیادہ صادق آتی ہے۔ اس لئے کہ لکھنے والا خطوں میں اپنے مخصوص انداز میں ذاتی میلانات ورجحانات پسند وناپسند، عادات واخلاق اور احساسات وجذبات کا اظہار کر جاتا ہے یوں خطوط صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔

جہاں تک اردو میں مکتوب نگاری کا تعلق ہے اس سلسلے میں اولیت کا سہرا مرزا غالب کے سر بندھتا ہے۔ مرزا کے خطوط نے قدیم مشکل اور پر تکلف اسلوب کی جگہ آسان، سادہ اور عام فہم انداز اختیار کیا۔ ان کے بعد سرسید، حالی، عبدالحق اور نیاز فتحپوری کے خطوط کی اپنی علمی اور ادبی حیثیت ہے۔ سرسید کے خطوں میں ان کی نثر کا رنگ نمایاں ہے۔ حالی کے خطوط میں ان کی شخصیت کی سادگی اور بے تکلفی کی عکاسی ہے۔ مولوی عبدالحق کے ہاں زبان کا لطف اور شگفتگی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ''غبار خاطر'' میں انشا پردازی اور تخیل کی بلند پروازی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ مہدی افادی اور نیاز کے خطوط میں بھی علمی انداز عام ہے ان کے علاوہ علمی اور ادبی اعتبار سے علامہ اقبال کے خطوط کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ ان کے خطوط متعدد مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ جتنے بڑے شاعر اور مفکر ہیں اتنے ہی بڑے انشا پرداز بھی ہیں۔ چنانچہ علامہ کی یہ خط وکتابت ان کے سیرت نگاروں اور فن شناسوں کے لیے ایک مستقل موضوع کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ علامہ کو خط لکھنے والے بے شمار لوگ تھے۔ دنیا کے ہر حصے سے ان کے پاس خط آتے، اور وہ بڑی پابندی کے ساتھ ہر خط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھتے، علامہ کے مکتوب الیہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے۔ تاہم ان میں سے چند مشاہیر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس لئے کہ علامہ کی علمی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں بالواسطہ طور پر ہی سہی ان کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح خود علامہ کے افکار وخیالات کا ان لوگوں پر اثر فطری امر ہے۔ان مشاہیر میں جہاں مولانا احسن مارہروی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسے علمائے ادب شامل ہیں۔وہاں قائداعظم محمد علی جناح، عبدالرب نشتر، سرسید راس مسعود، سید غلام بھیک نیرنگ اور خواجہ غلام السیدین جیسے سیاسی زعما کے نام بھی ملتے ہیں۔ان کے علاوہ مولانا غلام قادر گرامی، اکبرالہ آبادی، خواجہ حسن نظامی بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر آل احمد سرور، اختر شیرانی اسد ملتانی، عباس علی خاں، محمد اکرام، مولانا اکبر شاہ خاں، نجیب آبادی، سید نذیر نیازی اور مصورِ شرق عبدالرحمٰن چغتائی جیسے ادباء اور شعراء کے ساتھ ساتھ ان کے خاص احباب مہاراجہ کشن پرشاد کول اور عطیہ بیگم فیضی کے نام بھی اس فہرست میں شریک ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کا حلقہ بہت وسیع تھا، اور مختلف شعبہ حیات کے لوگوں سے ان کی خط وکتابت تھی لیکن ایک بات ہر جگہ نمایاں ہے کہ وہ ہر مکتوب الیہ کی ذہنی سطح کے مطابق خط لکھتے تھے اقبال عام طور پر خطوط عجلت میں لکھتے تھے کیونکہ ان کی اشاعت مقصود نہیں تھی۔خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''عدیم الفرصتی تحریر میں ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جسے پرائیویٹ خطوط میں تو معاف کر سکتے ہیں مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے''

پھر فرماتے ہیں ''میں پرائیویٹ خطوط کے طرز بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہوں' لیکن اس لاپروائی کے باوجود علامہ اقبال کے خطوط کی الگ ادبی شان ہے اور وہ زبان وبیان اور مواد کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ان خطوط کو فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو ایجاز واختصار ان کی بنیادی خصوصیت ٹھہرتی ہے تقریباً ہر خط کا مضمون مختصر ملتا ہے۔گویا وہ صرف کام کی باتیں کرتے ہیں اس کے علاوہ اقبال کے خطوط میں عام طور پر زبان کی سادگی پائی جاتی ہے۔انہوں نے کہیں بھی انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی۔البتہ جہاں کہیں موضوع کی دلکشی نے موقع فراہم کیا ہے وہاں انہوں نے زبان کی رنگینی اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے ہیں۔مثلاً مولانا گرامی کو ۱۹۱۸ء

میں ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

''گرامی کو خاکِ پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن؟ اس سوال کے جواب میں حسب الحکم مراقبہ کیا گیا جو انکشاف ہوا عرض کیا جاتا ہے گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں، کہ خاک اسے جذب کر سکے، یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی آگ اسے چھو جائے تو برد وسلام بن جائے۔پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔آسمان میں زمین میں یہ سما نہیں سکتی، کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔''

پھر فرماتے ہیں

''پانی آگ جذب کر لیتا ہے عدم بود کو کھا جاتا ہے پستی بلندی میں سما جاتی ہے مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب کرے؟ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی۔کہ اس کی قوتِ حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات وممات کا تناقض مٹا چکی ہے''

علامہ کے نجی خطوط میں باتیں کم اور علمی مسائل ومباحث زیادہ ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے خطوط میں ادبی سے زیادہ علمی انداز کارفرما نظر آتا ہے۔لیکن زبان کی سادگی اور ایجاز و اختصار کی بنا پر کہیں خشکی کا احساس نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہی ان خطوط کی خوبی ہے اقبال کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان خطوط کی مدد سے جہاں ہم اقبال کی سیرت کا ایک جامع مرقع ترتیب دے سکتے ہیں۔وہاں ان میں فکر اقبال کی تشریح اور فلسفہ اقبال کی تفسیر بھی ہمیں ملتی ہے۔

ان خطوط کے آئینے میں ہر قاری کو تین عکس صاف دکھائی دیتے ہیں ایک اقبال کی ذات کا عکس، دوسرے اقبال کے فکر وفن کا عکس اور تیسرے اقبال کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا عکس جہاں تک اقبال کی ذات کا تعلق ہے ان کے نجی خطوط کے مطالعے سے ان کے دلی خلوص، ان کی علم پروری اور اسلام دوستی اہل وعیال سے ان کی محبت دوستوں کے لئے ان کے ایثار اور عالم انسانیت کے لئے خیر سگالی کے جذبات نمایاں ہیں۔ہر بڑے ادیب کی تحریروں میں ان کے زمانے کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کی ترجمانی ملتی ہے اور خاص طور پر خطوط میں تو یہ عکاسی

زیادہ نمایاں ہے اقبال کے خطوط میں بھی یہ عکس خاصہ واضح ہے ۔اقبال کا سیاسی اور سماجی شعور اپنے اکثر ہم عصروں سے زیادہ بیدار تھا۔ وہ ایک شاعر اور مفکر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی سیاست سے متعلق تھے اور یہ اس وابستگی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے مملکت خداداد پاکستان کا خواب دیکھا اور ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اس مملکت کا خاکہ بھی پیش کر دیا۔اس کے علاوہ ممالکِ اسلامیہ کے اتحاد کے سلسلے میں ان کے دلوں میں جو تڑپ تھی اس کا اظہار بھی انہوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے خود ان کی شاعری کا بیشتر حصہ عالمِ اسلام کے لئے بیداری کا پیغام ہے۔ چنانچہ ان کے خطوط میں بھی اس کا اظہار ملتا ہے ۔بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں برصغیر پاک وہند کے جو سیاسی سماجی اور معاشی حالات تھے ان پر اقبال کی گہری نظر تھی ۔مختلف سیاسی اور سماجی زعماء سے ان کی مسلسل خط و کتابت اس کا بین ثبوت ہے اس سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناح، سردار عبدالرب نشتر، اکبر الہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ان کے خطوط مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں ۔

ایک شاعر کے خیالات وافکار صرف اس کی علمی وادبی نگارشات ہی تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اس کی نجی تحریروں خاص طور پر خطوط میں بھی ان خیالات وافکار کا عکس صاف جھلکتا ہے ۔علامہ اقبال کا فکر وفن، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے اور پیغام کی صحیح تفہیم کے لئے ہمیں ان کے خطوط سے بھی رجوع کرنا پڑے گا کہ ان خطوط میں مختلف مشاہیر کے ساتھ ان کے ادبی مسائل اور علمی مباحث کے ذریعے جہاں اقبال کا نظریہ فن واضح ہو جاتا ہے وہاں ان کے افکار وخیالات کی تشریح وتفسیر کا مرحلہ بھی آسان دکھائی دیتا ہے۔

(۱۹۷۲ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆

اقبال۔ایک ملی شاعر

یوں تو ملت اسلامیہ کسی بھی دور میں اہلِ فکر ونظر سے خالی نہیں رہی ۔اور ہر عہد میں یہ متاع گراں بہا اسے حاصل رہی ہے۔لیکن بہت کم شخصیات ایسی ہیں ۔جو صحیح معنوں میں ملت بیضا کے درد سے معمور ہوں اور اس کے لئے پیغام حکمت وبصیرت بھی رہی ہوں، حکیم الامت شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال بھی ایسے ہی صاحب بصیرت دانشور ہیں وہ حقیقی معنوں میں ہمارے ملی شاعر ہیں ۔اگر چہ ان سے پہلے بھی ہمیں حالی اور اکبر کے یہاں ملی شاعری کے نمونے ملتے ہیں ۔ لیکن اقبال کی ملی شاعری ان بزرگوں کی شاعری سے کہیں زیادہ فکر ونظر کی وسعت اور شعور کی گہرائی کے اعتبار سے ان سے بہت آگے ہے شروع شروع میں ان کی شاعری کی روح ملی نہ تھی ۔انہوں نے اساتذہ غزل اور خاص طور پر داغ کے تتبع میں غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔پھر نظم کی طرف آئے ۔تو وطنیت کے مروجہ جذبے سے متاثر تھے۔ چنانچہ اسی جذبے کے تحت انہوں نے یہ تک کہہ دیا تھا

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر زرہ دیوتا ہے

مگر جب اپنے قیام انگلستان کے دوران میں انہوں نے اہل یورپ کی وطنیت پرستی اور مادیت پسندی کا بغور مشاہدہ کیا۔تو وطن پرستی کے بارے میں ان کے خیالات بدلنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مغربی ممالک وطنیت اور قومیت کے نام پر ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں مصروف ہیں ۔تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطن کے نام پر قومیت انسانیت کے لئے مہلک ہے، اب انہوں نے قومیت کے تصور کو وطن کے تصور سے الگ کر کے دیکھا۔ چنانچہ ان کے نزدیک

مسلمانوں کی قومیت جسے وہ ملت کا نام دیتے ہیں ۔کسی خاص جغرافیائی خطہ زمین یعنی وطن سے نہیں بلکہ ان کے مذہب یعنی اسلام سے ہے۔اورزوال پذیر مسلمانوں فقط اسلامی تعلیمات پر عمل ہوکرہی دین ودنیا میں عظمت ورفعت حاصل کرسکتے ہیں ۔یورپ سے واپسی پر ۱۹۰۸ء سے لے کر آخر دم تک یعنی ۱۹۳۸ء تک اقبال مسلمانوں میں انہی اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں پوری طرح مصروف رہے ۔یورپ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے کہا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمار
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستان ہمارا

لیکن یورپ سے واپسی پران کا دل اسلام اورملت اسلامیہ کے درد سے معمور تھا۔اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کوسب سے پہلے پیغام یہ دیا۔کہ وہ کسی مخصوص خطہ زمین کے مالک نہیں ۔بلکہ نائب خداہونے کی حیثیت سے ہرملک ان کا ملک ہے ۔ہرملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست ۔چنانچہ اب انہوں نے فرمایا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمار

اقبال نے مسلمانوں کوتاکید کی ۔کہ وہ زمانے کی رو میں بہہ کروطن پرستی کونہ اپنائیں ۔ وطن کی محبت ہرانسان میں ہوتی ہے ۔اوریہ ایک فطری جذبہ ہے ۔لیکن وطن پرستی انسانیت کیلئے ہلاکت کا باعث ہے۔مسلمانوں کا تعلق کسی خاص خطہ زمین سے نہیں ۔بلکہ وہ ساری دنیا کے باشندے ہیں ۔انہیں وطنیت کے زہریلے افکار سے اپنا دامن بچانا چاہیے ۔وطن پرستی سب سے پہلے مذہب کوختم کرتی ہے ۔اورمسلمان اپنے مذہب کے بغیر کچھ بھی نہیں ۔وطنیت ایک محدود شے ہےاورمذہب لامحدود۔چنانچہ محدود کے لئے لامحدود کوچھوڑنا غلط ہے ۔فرماتے ہیں

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرھن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انہوں نے مسلمانوں کودوبارہ ابھرنے اورصاحب اقتدار ہونے کی تلقین کی ہے ۔مگر دنیا میں مقام بلند حاصل کرنے کے لئے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں ۔اقبال کے نزدیک یہ اصول و ضوابط صرف اورصرف اسلامی تعلیمات کواپنانے سے ہاتھ آسکتے ہیں ۔اوران کی عملی صورت ہمیں قرون اولی کے مسلمانوں کے اعمال میں نظر آتی ہے ۔چنانچہ اقبال فرماتے ہیں

گر تو می خواھی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یعنی اگرتو ایک مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ۔تو یہ صرف قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے ہی ہوسکتی ہے ۔

اپنی شاعری کے پہلے دور یعنی ۱۹۰۵ تک اقبال تصوف سے متاثر ہیں ۔مگر بعد میں وہ روائتی تصوف کے اس لئے مخالف ہوگئے تھے ۔کہ ان کے نزدیک سوائے مولانا روم ۔سنائی اور عطار کے اکثر صوفیا نے عملی زندگی سے فرار سکھایا ۔اوراس طرح مسلمانوں کونقصان پہنچایا ۔تصوف شروع میں انفرادی طور پر لوگوں کے تصفیہ باطن اورتزکیۂ نفس کا ذریعہ تھا ۔اوراس پر عمل کرنے والے اکثر لوگ اسلام کی روح کو سمجھتے تھے ۔اسطرح وہ تقلید کی رسم قبیح سے محفوظ رہے ۔لیکن بعد میں تصوف خود ایک قسم کی تقلیدی شے ہوگیا ۔اوراس کی وجہ سے مسلمانوں پر ایک طویل اور گہرا جمود طاری ہوگیا ۔چنانچہ اقبال نے مسلمانوں کوتصوف کے اس تقلیدی پہلو سے دوررہنے کیلئے کہا ہے ۔

رھانہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ ھائے کرامات رہ گئے باقی

اقبال اس بات کا اکثر اظہار کرتے ہیں کہ زندگی ' حرکت اور حرارت دراصل ایک شے کے نام ہیں ۔کائنات کی کوئی شے بھی حرکت وعمل سے باہر نہیں جوافراد یا گروہ یا قوم حرکت و عمل کوچھوڑ دیتی ہے ۔وہ اپنے زوال کے سامان خود پیدا کرتی ہے ۔مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب بھی ان کی بے عملی ہے ۔ان کے نزدیک مسلمانوں کوخیالی دنیا سے نکل کر حقیقی اور عملی دنیا میں

آنا چاھئے ۔زمانے کے تقاضے ہرلحظہ تغیر پذیر ہیں ۔اورانہیں عمل اورصرف عمل ہی سے پورا کیاجا سکتا ہے ۔جوقومیں ان تقاضوں سے چشم پوشی کرتی ہیں ۔زمانہ انہیں کچلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے ۔

سکوں محال قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان صرف عقائد سے نہیں بلکہ اعمال سے بنتا ہے ۔چنانچہ اقبال اپنے دور میں مسلمان بچوں کودی جانے والی تعلیم کے بھی اس لئے خلاف تھے ۔کہ وہ بے عملی کی تعلیم تھی ۔انہیں احساس تھا ۔کہ اگر ان بچوں کواسلامی تعلیمات سے روشناس نہ کرایا گیا ۔تو آئندہ مسلمان نسل کبھی عزت وسربلندی حاصل نہ کرسکے گی ۔انہیں خداوندان مکتب سے سخت شکایت ہے کہ وہ شاہینوں کوخاکبازی کادرس دے رہے ہیں ۔ان لوگوں کےنزدیک تعلیم کامقصد کسبِ معاش ہے ۔ان میں نہ خودایمان کی حرارت اورجوش ہےاورنہ آئندہ نسلوں میں یہ حرارت و جوش پیدا کررہے ہیں ۔لہذا مسلمانوں کواس فضول اور بے معنی تعلیم کی بجائے صحیح قرآنی تعلیم کو اپنانا چاہئے ۔ورنہ مکتبوں اورخانقاہوں سے نہ کوئی عالم پیدا ہوگا اورنہ دوریش اس لئے کہ ان میں نہ حقیقی علم ہے ۔اورنہ حقیقی روحانیت ۔

اقبال کی ملی شاعری کا مرکز ومحوران کا پیغام خودی ہے ۔ان کےنزدیک مسلمان جب تک اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوں گے ۔وہ مٹی کے ایک ڈھیر کی صورت ہوں گے ۔عرفان خودی کے لئے عشق ضروری شرط ہے ۔اورعشق سے مرادسرورکائنات ،نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مکمل پیروی ہے ۔اس لئے کہ

در دلِ مسلم مصطفٰے است
آبروئے ماز نام مصفطٰے است

ان کےنزدیک جیسے جیسے کسی کی خودی بیدار ہوتی جاتی ہے ۔ویسے ویسے اسکی قوت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔اورآخرایک وقت وہ آتا ہے جب صاحب خودی کے لئے بڑے سے بڑا

کام بھی ناممکن رہتا ۔اپنی خودی کی بیداری سے بندہ مومن خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر بات خودخدا کی بات بن جاتی ہے ۔اورخدا کے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں ۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

اقبال نے مسلمانوں کو جہاں انفرادی خودی کا درس دیا ۔وہاں اجتماعی خودی کی تعلیم سے بھی روشناس کیا ہے ۔ان کےنزدیک یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں صرف وہی قوم سربلند اورآزاد رہ سکتی ہے جس کے افراد قوم کی طرح ہرقسم کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار ہوں ۔افراد اور قوم کارشتہ لازم وملزوم کاسا ہے ۔فرماتے ہیں ۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اقبال فرماتے ہیں کہ افراد پر لازم ہے کہ ایک خاص حدتک اپنی خودی کو قائم اورمحفوظ رکھیں ۔اس کے بعد ملت کی فلاح وبہبود پر اپنی انفرادیت کوقربان کردیں ۔یعنی اپنی انفرادی خودی کوقومی خودی میں ضم کردینا چاہئے ۔اورمکمل اتحاد اور یک جہتی سے اجتماعی طور پر مصروف عمل ہونا چاہئے ۔یہی بےخودی کا فلسفہ ہے

اقبال تقلید کے بھی سخت مخالف ہیں ۔وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کودوسروں کی تقلید کرنے کی بجائے خودغور وفکر سے کام لینا چاہیئے ۔قرآن میں ہماری زندگی کے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے ۔لہذا دوسروں کی تقلید مسلمانوں کوغلط راستے پر لے جائے گی ۔یہی وجہ ہے جب سے مسلمانوں نے دوسروں کی تقلید کی روش اختیار کی ہے ۔اس وقت سے زوال پذیر ہیں ۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اقبال نے تصور پاکستان کواجاگر کرنے کےعلاوہ مسلمانان عالم کے اتحاد کا خواب بھی دیکھا ۔اوراس خیال کومسلمانوں کے سامنے بھی رکھا ۔وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کوفکری اورعملی طور پر

ایک ہونا چاہیے۔کیونکہ آپس کا انتشار اور اختلاف ہی ان کے زوال کا سبب ہے۔فرماتے ہیں

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اقبال مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔انہوں نے مسلمانوں کو غیر ملکی سرمایہ داری سے دور رہنے کے لئے کہا ہے۔کیونکہ اس سرمایہ داری میں انسان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔اخلاق تباہ ہو جاتا ہے۔لوگ دولت کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔اس کے مقابلے میں اقبال اسلامی تعلیمات کے مطابق دولت پر مستحق کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ان کے نزدیک دولت پر غریبوں اور حاجتمندوں کے علاوہ خود ریاست کا بھی حق ہوتا ہے۔

اقبال مسلمانوں کی خستہ حالی اور تباہی کے باوجود مایوس نہیں ہیں۔مایوسی ان کے نزدیک کفر ہے۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری شاعری کا لہجہ عام طور پر رجائی ہے۔وہ مستقبل سے مایوس نہیں۔بلکہ انہیں امید ہے کہ انشا اللہ مسلمانان عالم بہت جلد اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیں گے۔اور اقوام عالم کی رہبری کے فرائض انجام دیں گے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

نغمۂ توحید کا یہ مغنی صرف برصغیر کے مسلمانوں کے قلب ونظر ہی کو جلا نہیں بخشتا رہا۔بلکہ اس کا پیغام دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ہے۔اس کا دل دردمند پوری ملت اسلامیہ کے لئے دھڑکتا رہا ہے۔اور اس کے افکار کی روشنی مشرق سے لے کر مغرب تک توحید پرستوں کے دلوں کو منور کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کوالالمپور سے لے کر رباط تک اسلامیان عالم اقبال کو اپنا ملی شاعر مانتے ہیں۔اور اس کے افکار کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھتے ہیں۔

(۱۹۷۲ء)

اقبالؒ اور وحدت ملی

کائنات میں جب پہلے پہل خالقِ ارض وسما نے انسان کو تخلیق کیا تو اسے اجتماعی زندگی کا شعور بھی بخشا یہ اسی شعور کا تقاضہ تھا۔کہ خاندان برادری اور قبیلے وجود میں آئے چنانچہ اسی نسلی وحدت نے ایک عرصے تک انسانوں کو آپس میں مربوط کئے رکھا پھر لسانی وحدت کا احساس بیدار ہوا کچھ مدت بعد جغرافیائی وحدت نے اس جمعیت کو اور وسعت عطا کی اور پھر مذہب نے اجتماعیت کے ان سارے محرکات کو عقیدے کے تحت یکجا کر دیا چنانچہ مذہبی برادری تمام چھوٹی چھوٹی برادریوں پر محیط ہو گئی اور بالآخر مذہب اسلام کی شکل میں انسانوں کو بہترین لائحہ عمل میسر آ گیا۔اسلام نے انسانی اجتماعیت کو ایک وسیع تر مفہوم سے آشنا کیا اور یوں ملت اسلامیہ قوم، ملک، زبان اور رنگ ونسل کے تمام بتوں کو توڑ کر وحدت ملی کے عظیم مرکز پر مجتمع ہو گئی حتیٰ کہ پوری ملت ایسا جسد واحد بن گئی جس کے کسی عضو میں ذرا سی تکلیف سے پورے جسم میں تکلیف محسوس کی جانے لگی مگر افسوس کہ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان معاشرہ وحدت ملی کے اس تصور سے دور ہوتا گیا اور آج یہ حالت ہے کہ ہم اتحاد ویگانگت کی دولت سے بے بہرہ ہیں اور ہمارے باہمی اختلافات نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا لیکن اس تمام تر زبوں حالی کے باوجود بھی دیکھا جائے تو مجموعی طور پر ابھی ایک قوم اور ایک ملت کے حصار میں محصور ہیں۔شاعر مشرق حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ اسی وحدت ملی کے داعی اور مبلغ تھے اور مفتی محمد عبدہ، اور علامہ جمال الدین افغانیؒ کے بعد وہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ان کے افکار عالیہ کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے کلام کا غالب حصہ وحدت ملی کے نظریئے کی ترویج و اشاعت پر مشتمل ہے ملت کے بارے میں ان کا نظریہ وہی ہے جو اسلام کا ہے چنانچہ جہاں وہ تحفظ

خودی پر زور دیتے ہیں وہاں بے خودی کا نظریہ بھی ان کے ہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے بے خودی سے ان کی مراد مدہوشی یا مستی نہیں بلکہ انہوں نے خودی کی طرح اس لفظ کو بھی ایک نیا مفہوم بخشا ہے چنانچہ جہاں وہ فرد کی زندگی کی تکمیل کے لئے اس کی ذاتی خودی کے تحفظ کو بنیاد قرار دیتے ہیں وہاں قومی زندگی کے تحفظ کے لئے ذاتی خودی کو قربان کر دینے کی تلقین کرتے ہیں یہی وہ مقام ہے جہاں ہر فرد ملت کا جزو لاینفک بن جاتا ہے اور یہی وہ جذب باہمی ہے جو کائنات کی نظم وضبط کی دلیل ہے۔

اقبال وحدت ملی کے لئے وحدت فکر وعمل کو اساس قرار دیتے ہیں

چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

جب تک افراد فکری وعملی طور پر ملت سے ہم آہنگ نہ ہوں وہ انتشار وافتراق کا شکار رہیں گے اور اسی صورت میں نہ تو وہ ترقی کی منزلیں طے کر سکیں گے اور نہ اپنی بقا اور سلامتی کا تحفظ کر سکتے ہیں چہ جائیکہ دوسری اقوام پر غالب رہیں ایک منتشر اور غیر متحد قوم خدانخواستہ غلامی کی عبرتناک زندگی سے بھی دوچار ہو سکتی ہے۔ جہاں اس سے اس کے ذوق عمل اور تخلیق صلاحیتیں ہی نہیں اس کی آبرو اور وقار کا احساس بھی چھن جاتا ہے۔ اقبال فرد کو ملت کے ساتھ منسلک دیکھنا چاہتے ہیں ان کے خیال میں فرد کی نشوونما ملت کے ربط کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ انسان دوسروں کے ساتھ رہ کر اپنی تمام تر تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے اجتماعی ماحول کے بغیر اس کی ذات کے جوہر اصلی یعنی خودی کا ظہور ممکن نہیں جو اس کی بقا اور ارتقا کے لئے ناگزیر ہے چنانچہ فرماتے ہیں

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

دریا موجوں کے مجموعے کا نام ہے اسی طرح ملت بھی افراد کے مجموعے کا نام ہے ہر فرد کا اپنا ایک وجود ہے لیکن اس کا یہ وجود ملت کے ساتھ ربط وضبط رکھنے ہی سے قائم ہے ورنہ وہ

بے حیثیت ہے جس طرح موج جب تک دریا میں ہے، موج کی حیثیت سے زندہ رہتی ہے لیکن دریا سے باہر اس کا کوئی وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح فرد جب تک ملت کے ساتھ منسلک ہے فرد ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقوام کی تقدیر بھی افراد کے سعی وعمل ہی کی مرہون منت ہے۔ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا سہارا۔

فرد کی حیثیت ملت کی وجہ سے ہے اور ملت کی حیثیت افراد کی وجہ سے کیونکہ وہ افراد ہی کے مجموعے کا دوسرا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں فرد اور ملت لازم وملزوم ہیں۔ ایک کا دوسرے کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا اسی لئے اقبال ملت بیضا کے افراد کو اپنی ملت کے ساتھ ایک مستحکم رابطہ قائم رکھنے کا درس دیتے ہیں کہ اسی رابطے سے مسلمان عظیم عالمگیر قوت بن کر ابھر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

گویا شجر ملت سے پیوستہ رہ کر ہی بہار اسلام کی امید رکھی جا سکتی ہے اس لئے ان کے خیال میں ملت بیضا کے افراد یعنی مسلمانان عالم اگر ذاتی اور اجتماعی طور پر دنیا کی نظروں میں معزز ومحترم ہونا چاہتے ہیں۔ تو انہیں ملت اسلامیہ کے مرکز کو مضبوطی سے تھامنا ہوگا ورنہ مرکز سے جدا ہو کر انکی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ سکتی۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

پھول کی خوشبو اس وقت تک اپنی اصلیت پہ قائم رہتی ہے جب تک وہ پھول میں رہے اس سے جدا ہو کر پریشانی اس کا مقدر بن جاتی ہے

اپنی اصلیت پر قائم تھا تو جمعیت بھی تھی چھوڑ کر گل کو پریشان کارواں تو ہوا

اتحاد بذات خود ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے اور معاشرے میں اس کی اہمیت مسلم ہے یوں

تو بنی نوع انسان کے فروغ وکمال کے لئے ہر دور میں اس کی ضرورت رہی ہے لیکن دوسری اقوام کے مقابلے میں مسلمانان عالم کا اتحاد زیادہ قوی مؤثر اور ممکن العمل ہے کیونکہ وہ توحید پرست ہیں فکری اور عملی لحاظ سے ایک ہیں ایک خدا ایک رسول اور ایک کتاب پر متفق ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ وحدت کی شکل اختیار نہ کریں ۔اقبال فرماتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ،ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مسلمانوں کا ایک ہونا ان کی دینی اور دنیاوی سربلندی اور کامیابی کی ضمانت ہے قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے مت ہو۔تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔یکجہتی کی ہمہ گیر اقدار پر عمل پیرا رہے کامیابی وکامرانی ان کا مقدر رہی ۔دنیوی جاہ وجلال اور شان وشوکت نے ان کے قدم چومے لیکن جونہی ان میں فرقہ بندی رواج پانے لگی وہ قعرِ ذلت میں گرنے لگے گویا اتحاد واتفاق ہمارے ملی عروج وترقی کا سبب اور انتشار وافتراق ہمارے زوال وپستی کا باعث ہیں چنانچہ احیائے ملت کے لئے وحدت قائم کرنے کی ضرورت واضح ہے ۔یہ وحدت جغرافیائی حدود کی پابندی نہیں اور کرہ ارض پر یورپ امریکہ افریقہ یا ایشیاء ہی نہیں بلکہ تمام کائنات کا احاطہ کر سکتی ہے اسلام نے رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹا کر وحدت ملی کا نظریہ پیش کیا ہے اس کی رو سے تمام ملت اسلامیہ باہم یک ذات یک جہت اور یک جان ہے اور یہ وہ اخوت ہے جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے ۔اقبال اسی اخوت ومحبت کے پیامی ہیں جو وحدت ملی کے لئے ناگریز ہے

چنانچہ مختلف مقامات پر فرماتے ہیں۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

تمیزِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے فشاں ہو جا

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اقبال کے نزدیک مشرق سے لے کر مغرب تک تمام مسلمانوں کی نجات اور سربلندی کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ دین حق کی پاسبانی کے فرائض کی انجام دہی کے لئے اتحاد اور اخوت کو اپنائیں ۔اسی میں ان کی فلاح ہے مشرق اور مغرب کے مسلمان جب تک ایک دوسرے کو اپنا بھائی

نہیں سمجھیں گے نہ وہ مشرق میں سرخرو رہ سکتے ہیں اور نہ مغرب میں سرفراز ان کی عزت اور وقار اسی میں ہے۔ کہ وہ رنگ و نسل کے امتیازات کو مل کر ختم کر کے ملت اسلامیہ کے ایک مرکز پر جمع ہوں اس طرح اجتماعی طور پر وہ ایک نا قابل تسخیر قوت بن جائیں گے۔

اقبال اسلامیان عالم کی نشاۃ الثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے چنانچہ ان کی دلی تمنا تھی کہ مسلمان سیاسی طور پر ایک مرکز پر مجتمع ہو جائیں۔ ان کا یہ خواب ان کی زندگی میں تو پورا نہ ہو سکا البتہ ان کے وصال کے ایک عرصے بعد اب اس کی عملی تعبیر کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ باہمی اتحاد و اخوت کی منزل کی طرف عظیم الشان اسلامی سربراہی کانفرنس اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں۔

(۱۹۷۴ء)

☆☆☆☆☆☆

اقبال اور عشق رسولؐ

حکیم الامت، شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کے افکار عالیہ میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ان کے نزدیک عشق راز حیات ہے سرمایہ زندگی ہے اس کے دم سے زندگی میں نغمگی ہے کہ یہ نور حیات بھی ہے اور نار حیات بھی۔

عشق کی راہ مصائب و مشکلات سے معمور ہے مگر عاشق ان مصائب و مشکلات کو راحت خیال کرتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل تگ و دو جاری رکھتا ہے

جس کو عشق کی دولت نصیب ہو گئی اس نے سب کچھ پا لیا عشق کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر دین بھی مکمل نہیں کہ عشق سر دین ہے اور اس راہ کا سالک اسی زینے سے بارگاہ خداوندی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے

علامہ کے افکار میں عشق کہیں عمل کا دوسرا نام ہے اور کہیں ایمان کا جس کے دم سے کفر مسلمانی اور نہ ہونے سے مسلمانی بھی کفر سے کم نہیں

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق

کہیں یہ خلیل اللہ کا صدق بن کر ابھرتا ہے کہیں حسین کے صبر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور کہیں زندگی کے معرکے میں بدر و حنین کی صورت میں جلوہ افروز ہے۔

اور یہی عشق کہیں دم جبرئیل ہے کہیں دل مصطفیٰ کہیں خدا کا رسول ہے اور کہیں خدا کا کلام ہے۔

جسم ورح ظاہر و باطن سب پر عشق کی حکومت ہے اس میں بے پناہ قوتیں پوشیدہ ہیں عمل عشق کے دم سے ہی جلا پاتا ہے کہ عشق اصل حیات ہے اور زمانے کی تیز و تند رو کا مقابلہ سیل عشق ہی کر سکتا ہے۔

جب یہ عشق خودشناسی اور خود آگہی کے آداب سے واقف کرتا ہے تو صدیوں کے غلاموں پر شہنشاہی کے اسرار رکھلنے لگتے ہیں عطار رومی۔رازی اور غزالی کو عشق ہی کی بدولت آہ سحر گاہی کی نعمت ملتی ہے اسی کے طفیل مرد فقیر کو وہ بوئے اسد اللہی حاصل ہوتی ہے جو اسے دارو سکندر ایسے پر جلال بادشاہوں سے بھی بلند مقام عطا کرتی ہے کہ حق گوئی و بے باکی اس مرد حق کی فطرت بن جاتی ہے۔

علامہ نے عشق کو مقاصد کی لگن کے معنوں میں استعمال کیا ہے جس کے بغیر انسان کا معنوی ارتقا نامکمل رہتا ہے۔

خودی کو محکم و مستحکم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے کہ یہ شدت احساس کی وہ حالت ہے جو حیرت ناک حد تک انسانی شخصیت کو لازوال بنا دیتی ہے۔اور اس طرح تسخیر فطرت کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کی خلقت کا ایک بڑا مقصد ہے۔یہ تسخیر عقل کی طرح کسی مفاد یا منفعت کی تابع نہیں بلکہ انسان کو عالم کون و مکاں کی آقائی اور دنیوی ماحصل سے بے نیازی کی دولت عطا کرتی ہے۔فرماتے ہیں

فطرت کو خرد کے رو برو کر
تسخیر مقام رنگ و بو کر

اور یہی وہ مقام ہے جہاں مرد مومن کو نائب خدا کا درجہ ملتا ہے اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور غالب و کار آفرین ہوتے ہوئے وہ زمانے کی مشکل کشائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

بندہ مومن خاکی ہوتے ہوئے بھی نوری صفات رکھتا ہے کہ اس میں اس کے آقا کی صفات کا عکس ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا دل دونوں جہاں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

وہ دلفریب اداؤں اور دل نواز نگاہوں کا مالک ہے وہ دنیا سے کم امیدیں لگاتا ہے اور زیادہ تر اپنے عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

وہ گفتگو کے وقت نرم ہے لیکن میدان عمل میں انتہائی گرم رزم ہو یا بزم وہ ہمیشہ پاک دل و پاک باز رہتا ہے یہ نرمی اور سختی بندۂ مومن کی شخصیت کا جوہر ہے۔

اسی بندۂ مومن کا ایمان حق کا مرکز قرار پاتا ہے اور اس کے سامنے یہ دنیا ایک خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

اسی کو اقبال عقل کی منزل اور عشق کا حاصل قرار دیتے اور اسے حلقہ آفاق میں گرمی محفل کا سبب سمجھتے ہیں۔

مومن کا مقام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ جبریل و سرافیل جیسے جلیل القدر تک بھی اس کے زیر دام ہوتے ہیں

اس مرد مومن کی شخصیت ایسی بوقلموں ہے کہ ہر پل ہر ساعت اور ہر گھڑی گفتار ہو یا کردار اس میں ایک نئی آن ایک نئی شان دکھائی دیتی ہے۔

بندہ مومن کو یہ مقام عشق کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔اور یہ عشق توحید و رسالت پر کامل ایمان کا دوسرا نام ہے۔

دین عشق کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور نہ دنیا کی مشکلات اس کے بغیر حل ہو سکتی میں چنانچہ یہی وہ عشق تھا جس نے ضعیفوں کو قوی اور فقیروں کو بادشاہ بنا دیا تھا

کلام اقبال کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے اقبال نے لفظ عشق کو زیادہ تر عشق رسول صلی علیہ وآلہ وسلم کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور جہاں کہیں بندہ مومن یا مرد مومن کا لفظ استعما کیا ہے وہ مثالی انسان یا فوق البشر کے معنوں میں ہے جس سے ان کے نزدیک مراد ہے سرور کائنات، خاتم النبین سرکار دو عالم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات۔

گویا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے کلام کا مرکز محور ہے

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ است
اگر بہ اورنہ رسیدی تمام بولہبی است

ان کے نزدیک عشق رسول ہی ایسی کسوٹی ہے جس پر ایمان کو پرکھا جا سکتا ہے
اگر یہ دولت حاصل نہیں تو کتنی ہی عبادت وریاضت کرلی جائے ۔بے فائدہ اور بے ثمر ہے۔
علامہ رحمت عالم سے محبت کو قربِ الٰہی کا وسیلہ سمجھتے ہیں چنانچہ لوح وقلم تک کو عاشق رسول کی ملکیت قرار دیتے ہیں۔

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

کلام اقبال کےعلاوہ سیرت اقبال کا بھی مطالعہ کیا جائے ۔تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عشق رسول اقبال کی پوری زندگی میں جاری وساری تھا۔
علامہ کی طبیعت میں اس قدر سوز وگذار تھا اور وہ عشق رسول میں اس قدر سرشار تھے کہ جب بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر پاک ہوتا بے تاب و بے قرار ہو جاتے اور دیر تک ان کی آنکھیں پرنم رہتیں۔
علامہ کے نزدیک عشقِ رسولؐ سرِ دین بھی ہے اور وسیلۂ دنیا بھی ۔اس کے بغیر انسان نہ دین کا ہے نہ دنیا کا۔

دردلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ماز نام مصطفیٰ است

اور یہ عشق رسولؐ کا کرشمہ تھا کہ مغرب کے افکار کی چکاچوندھ بھی ان کے دل سے خاک مدینہ ونجف کی عظمت ورفعت نہ بھلا سکی۔
معراج کائنات میں ایک عظیم واقعہ ہے جب خاتم النبیین سرکار دو عالم معبود حقیقی کے حکم سے آسمانوں کی سیر کو تشریف لے گئے اور محبوب ومحبّ میں راز ونیاز کی باتیں ہوئیں اقبال اس واقعے کو انسانی عظمت کی دلیل سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کا کلام اور ان کی زندگی سرور کائنات کی سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں کی روشنی سے منور ہے ان کا دل ایک سچے عاشق رسول کا دل بن کر دھڑکتا ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہ عشق ومستی ہیں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسین وہی طٰہٰ

مولائے کل رحمت عالم کی خوابگہ مدینہ منورہ ہر عاشق رسول کے لئے قبلہ وکعبہ کا درجہ رکھتی ہے اس لئے کہ خود ربِ کعبہ بھی اسی ذات والا صفات کا شیدا وا لا ہے ۔جس سے اس مقدس شہر کو نسبت ہے اقبال اس مقام کو ایسی ادب گاہ سمجھتے ہیں ۔جو عرش سے بھی نازک تر ہے اور جہاں حضرت جنید بغدادی اور حضرت بزید بسطامی جیسے اکابر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔
اقبال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کائنات کا ایسا محور ومرکز سمجھتے ہیں جس کی تلاش میں زندگی کے قافلے رواں دواں ہیں۔

آیہ کائنات کا معنی دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

اقبال ایسے عاشق رسول تھے جن کی ایک ایک سانس عشق رسول کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی ۔یہ وہ مقام ہے جو ہر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔
چنانچہ وصال کے وقت بھی حکیم الامت کے لبوں پر حجاز مقدس ہی کا ذکرِ خیر تھا اور انہوں نے یہ چار مصرے بار بار دہراتے ہوئے جان جان آفرین کے سپرد کردی۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

قرآن مجید میں خود خالق کائنات جس ذات پاک کی تعریف و مدح فرماتا ہو ایک انسان کی کیا مجال کہ اس کی کوئی توصیف کر سکے۔ لیکن پھر بھی حضرت حسان بن ثابت سے لے کر آج کے دور کے شاعر تک ہر سخنور نے اپنی اپنی بساط کے مطابق نعت رسول مقبول کہنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں بعض شعرا کو قبولیت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے اقبال وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے نعت کے عنوان سے اگر چہ با قاعدہ کوئی نظم نہیں کہی۔ لیکن ان کے پورے کے پورے کلام میں عشق رسول وصف رسول اور سیرت رسول کا واضح عکس ملتا ہے تاہم ان کے اشعار نعت کے زمرے میں شمار ہو سکتے ہیں اور بلاشبہ اپنے انداز بیاں کے سبب کئی روائتی انداز کی نعتوں پر بھاری ہیں مثلاً لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب:

گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
زرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکت سنجر وسلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید وبا یزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو عشق حضور واضطراب

(۱۹۷۴ء)

اُردو نثر کا ارتقاء

مسلمان فاتحین جب برصغیر میں وارد ہوئے تو یہاں کے مقامی باشندوں سے میل جول کے باعث ان کی زبانوں نے آریائی زبانوں پر گہرا اثر ڈالا اس ملی جلی زبان کو پہلے پہل لین دین اور دین ومذہب کی ضروریات کے لئے استعمال کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بڑھا تو یہ با قاعدہ ایک زبان کی صورت اختیار کر گئی۔ یہی اُردو زبان تھی۔

اُردو کو وجود میں آئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اُس وقت ایک کاروباری اور بول چال کی زبان تھی۔ کیونکہ سرکاری زبان فارسی تھی اور ادبی اور مذہبی اہمیت سنسکرت کو حاصل تھی۔

چنانچہ اس زبان کی ابتداء کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں دکن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دکن جسے سب سے پہلے علاؤالدین خلجی نے فتح کیا تھا۔ پھر محمد تغلق نے اپنا دارالحکومت یہاں تبدیل کیا یہیں کے ایک سردار بہمن شاہ نے سلطان کے خلاف بغاوت کر کے یہاں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اس کے ساتھ ہی دکن میں اُردو کی ترقی کا دور شروع ہوا۔

اُردو کو دکن کی سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اس سرکاری سرپرستی کے علاوہ دکن کے صوفیائے کرام نے بھی اس زبان کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا کہ انہوں نے اُردو ہی کو تبلیغ اسلام کا ذریعہ قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی ادب کا غالب حصہ صوفیانہ ادب پر مشتمل ہے۔

یوں دکن میں اُردو شعر وسخن کے ساتھ ساتھ نثر کا رواج شروع ہوا۔ اور بہمنی دور میں حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ نے متعدد مذہبی کتب تصنیف کیں جن میں ہدایت نامہ، رسالہ، سہ بارہ اور معراج نامہ یا معراج العاشقین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معراج العاشقین اُردو نثر کا قدیم نمونہ ہے۔ جس کا زیادہ تر ذخیرہ الفاظ مذہبی اصطلاحات و

الفاظ پر مشتمل ہے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

''نبیؐ کہے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اوجیا لے کے ہور اندھیار کے۔اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھو اور دیکھو بے پردا اندھارے کے اوجیا لے کے عارفان پر ہے۔واصلان پر پردے نورانی دے واصلان کا صفا پردہ ہوتا ہے''۔

بہمنی دور کے بعد قطب شاہی دور آتا ہے۔جس میں مولانا عبداللہ کی ''احکام الصلواۃ'' ایک دینی کتاب ہے۔اس کی نثر بھی ''معراج العاشقین'' سے ملتی جلتی ہے۔''بات کرے سوں نماز جاتا ہے۔نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگنے نماز جاتا ہے۔ہی واہ کہنے سوں نماز جاتا۔دردسوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے۔

گولکنڈہ کے فرمانروا بہت علم دوست اور ادب پرور تھے۔چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر اسی دور کے ایک اور معرف ادیب ملا وجہی نے ''سب رس'' کے نام سے ایک ادبی کتاب لکھی جس کا موضوع اخلاق وتصوف ہے۔

''سب رس'' ادبی نقطۂ نظر سے قدیم اُردو میں بہت اہم کتاب ہے۔اس کا قصہ بھی عجیب ہے اور انداز بیان بھی۔حُسن اور دل اس کے خاص کردار ہیں۔جن کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کہانی مرتب کی گئی ہے۔اور اس کہانی کے پردے میں علم وحکمت اور تصوف واخلاق کے اہم معاملات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

''عشق خدا کوں بھیدیا تو اس کی خاطر آسمان زمین ہو یدا کیا، عشق خدا کوں بھیدیا تو اپنا حبیب کر محمدؐ کوں پیدا کیا گیا۔اگر محمدؐ نا ہوتا تو آسمان زمین نا ہوتا۔اگر محمدؐ نا ہوتا تو ماہ پرویں نا ہوتا۔اگر محمدؐ نا ہوتا تو دنیا ہور دین نا ہوتا''۔

قطب شاہی دور کے بعد عادل شاہی دور آتا ہے۔جس میں شاہ برہان الدین کی کتاب ''معرفت القلوب'' قابل ذکر ٹھہرتی ہے۔اس کا انداز بھی تقریباً وہی ہے جو ''سب رس'' میں ملا

وجہی کا تھا اور اس کا موضوع بھی تصوف واخلاق ہے۔

''طریقت کا ہو معرفت کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالماں کوں ہور عاشقاں کوں ہور واصلاں کوں ابتو سب کو تسلی دکھلاتا ہے۔ہور دل کوں ان پر کر راحت پاتے ہیں''۔

دکن کی قدیم نثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو میں اس وقت ایک ادبی زبان بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔اُدھر شمالی ہند میں بھی کچھ کتابیں نثر میں لکھی گئیں۔جو زیادہ تر قصے کہانیوں اور مذہبی مسائل پر مشتمل تھیں۔ان میں عطا حسین خان تحسین کی ''نوطرز مرصع'' اور شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔''نوطرز مرصع'' مشہور فارسی کتاب ''قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔لیکن اس کا اسلوب نہایت پر تکلف اور مرصع ہے۔

اسی عہد میں برصغیر کے انگریز حاکموں نے انگریز ملازموں کو اُردو سکھانے کے لئے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے نام سے کلکتے میں ایک کالج قائم کیا جس کے سربراہ ڈاکٹر جان گلِ کرائسٹ تھے۔

ڈاکٹر جان گلِ کرائسٹ نے اُردو زبان کی توسیع اور فروغ کے لئے بڑی خدمات انجام دیں۔اُردو ادب اس وقت تک زیادہ تر شعر وشاعری تک محدود تھا۔نثر برائے نام تھی۔وہ بھی قصوں کی صورت میں مختلف علوم وفنون کی کتب اُردو میں مفقود تھیں۔چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ترجمہ وتالیف کے تحت متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔

فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گلِ کرائسٹ نے بہت سے اہل کمال کو جمع کیا اور ان کی کاوشوں کو شائع کیا گیا ان میں حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مظہر خانِ ولا کاظم علی جوان اور میر امن کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حیدر بخش حیدری کی تصانیف میں طوطہ کہانی، آرائش محفل ہفت پیکر، گل پیکر، گل معرفت گلزار دانش اور گلدستہ حیدری بہت مشہور ہیں۔اُن کی زبان میں شگفتگی اور صفائی ہے مگر وہ عربی و

فارسی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ان کے کثر جملے بھی طویل ہوتے ہیں۔

شیر علی افسوس نے گلستان کا ترجمہ کیا۔ان کی زبان میں سادگی اور سلاست ہے۔اسی طرح میر بہادر علی حسینی اپنی کتاب ''نثر بے نظیر'' کی وجہ سے مشہور ہیں جو مثنوی سحر البیان کا نثری ترجمہ ہے۔

مظہر خان ولا نے ہند نامہ اور کریما کا ترجمہ کیا اس کے علاوہ ہفت گلشن، اتالیق ہندی، بیتال پچیسی اور تاریخ شیر شاہی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

کاظم علی جوان نے معروف ہندی ڈرامے شکنتلا کا اُردو ترجمہ کیا، جس سے اُردو زبان پہلی مرتبہ ڈرامے سے آشنا ہوئی اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ فرشتہ کا بھی ترجمہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں میں سب سے اہم شخصیت میر امن کی ہے جن کی تصنیف ''باغ و بہار'' انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔''باغ و بہار'' میں انہوں نے قصہ چہار درویش کا سلیس اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔لیکن یہ ترجمہ طبغراد سے بڑھ کر ہے۔پھر اس کی زبان سادہ صاف اور رواں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

''ایک دن میں جہاز کی کوٹھڑی میں سوتا تھا کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔میں ہڑ بڑا کر چونکا اور باہر نکلا یہ عمتا بھی میرے ساتھ ہولیا۔دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی بار پر ہاتھ ٹیکے نہوڑا ہوا تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے۔اور مجھے پکارتا ہے۔میں نے پاس جا کر ''خیر تو ہے؟'' بولا عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے۔کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لئے ہوئے ناچتے ہیں''

فورٹ ویم کالج کا قیام سادہ نثر نویسی کی ترویج میں اہم مقام رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود برصغیر میں فارسی اثرات غالب تھے، اور فارسی الفاظ کو عبارت آرائی کے لئے مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔چنانچہ جب انشاء نے خالص اُردو میں ''رانی کیتکی'' لکھی تو اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو مرزا رجب علی بیگ سُرور کی فسانہ عجائب کو حاصل ہوئی۔

لکھنؤ جو اس دور میں شاعری کا مرکز تھا۔نثری لحاظ سے اس کا دامن خالی تھا۔چنانچہ اس

ماحول میں ''فسانہ عجائب کی تصنیف کسی اعجاز سے کم نہیں، یہ کتاب دراصل میر امن کی باغ و بہار'' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔میر امن کے سادہ اُسلوب کے مقابلے میں سُرور نے پر تکلف اور مرصع و مسجع انداز اختیار کیا۔

جس طرح ''باغ بہار'' اس دور کی دلی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔اسی طرح ''فسانہ عجائب'' اپنے عہد کے لکھنؤ کا زندہ معاشرتی مرقع ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''سبحان اللہ وبحمدہ عجب شہر گلزار ہے۔ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے، ہر شخص اپنے طور پر باوضع قطعدار ہے۔دورویہ باغ کس انداز کا ہے۔ہر دوکان میں سرمایہ نازونیاز کا ہے۔ہر چند ہر محلے میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے۔پر اکبری دروازے سے جلوخانے اور پکے پُل تک صراط مستقیم ہے''۔

اسی زمانے کی یادگار دلی کالج ہے جہاں مشرقی و مغربی علوم ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔اور ذریعہ تعلیم اردو تھا۔اس کالج کے زیر اہتمام تاریخ جغرافیہ۔ریاضی۔کیمیا۔طب۔ جراحت اور معاشیات ایسے موضاعات پر کم وبیش ایک سو کتابیں تالیف ہوئیں۔اسی کالج کے ایک استاد رام چند نے تذکرۃ الکاملین لکھا۔مولانا صہبائی بھی اسی کالج کی ایک اہم شخصیت تھے۔

یہی دور مرزا غالب کا دور بھی ہے۔اُردو ادب میں غالب کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کے شہسوار ہیں اور دونوں میدانوں میں ان کی شہرت ہے۔غالب سے پہلے اُردو نثر تکلف، تصنع اور وقت پسندی کا شکار تھی۔لیکن غالب نے اپنی سادہ اور بے تکلف نثر کے ذریعے ایک انقلاب برپا کیا یوں وہ جدید اُردو نثر کے بانی کہے جا سکتے ہیں۔

غالب کی نثر خطوط کی شکل میں ہے۔ان کی سادگی بے تکلفی اچھوتا مگر سادہ انداز بیان مختصر جملے روزمرہ بول چال کا انداز، واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی ایسی خوبیاں ہیں۔جنہوں نے اُردو میں ایک نئے اُسلوب کی بنیاد رکھی انہوں نے خطوط نویسی کا پرانا انداز ترک کر کے اس میں ظرافت۔شوخی اور شگفتگی کا رنگ بھرا جو زندگی کی دلیل ہے۔ایک نمونہ دیکھئے۔

''جولائی سے مہینہ شروع ہوا۔شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مہینہ کی نئی صورت دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔بالا خانے کا دالان میرے بیٹھنا اٹھنے سونے جاگنے جینے مرنے کا محل اگر چہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی کہیں لگن کہیں چلمچی۔ اگال دان رکھ دیا قلمدان کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیئے مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا اب نجات ہوئی ہے۔

غالب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ہم عصر ادبا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔چنانچہ سرسید اور ان کے رفقائے نے بھی سادہ نویسی کے اسی اُسلوب کو اختیار کیا جن کی بنیاد غالب نے رکھی تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی مغل سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ بھی آخری ہچکی لے کر گل ہو چکا تھا۔مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی ایسے میں سرسید احمد خاں ایسے مردقلندر نے قوم کی رہبری کا فریضہ انجام دیا۔

سرسید نے جہاں مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی بیداری میں حصہ لیا۔وہاں ان کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا اس کے علاوہ علمی اور ادبی لحاظ سے بھی مقصدیت اور حقیقت پسندی کے حق میں ایک تحریک چلائی۔

سرسید کی اس ادبی تحریک میں ان کے رفقاء نے نمایاں حصہ لیا۔ان میں محسن الملک وقار الملک مولوی چراغ علی۔مولوی ذکا اللہ مولانا حالی۔مولانا شبلی اور مولوی نذیر احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

محسن الملک، وقار الملک اور چراغ علی نے مذہبی موضوعات پر متعدد کتب تصنیف کیں جب کہ مولوی ذکا اللہ نے تاریخ جغرافیہ اور ریاضی پر کئی کتابیں تحریر کیں۔

حالی نے حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب لکھ کر اُردو میں سوانح نگاری کو رواج دیا اس کے علاوہ انہوں نے مقدمہ شعر وشاعری کی صورت میں اُردو میں عملی تنقید کی پہلی روایت

قائم کی۔

مولوی نذیر احمد نے اُردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل کیا۔مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ابن الوقت محصنات۔ایامیٰ۔توبۃ النصوح وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔انہوں نے قرآن مجید کے علاوہ تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی کیا۔جو آج تک رائج ہے۔

مولانا شبلی نے تاریخ وتنقید کے میدان میں بے مثال کارنامے انجام دیئے ان کی تصانیف میں الغزالی۔المامون۔الفاروق۔الکلام۔سوانح مولانا روم، شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر کے علاوہ سیرت النبیؐ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اور اس دبستان کے صدر خود سرسید احمد خاں نے تاریخ سیاست۔فلسفہ۔اخلاق دینیات اور دیگر علمی موضوعات پر مضامین لکھ کر اُردو کے دامن نثر کو وسیع سے وسیع تر کیا ان کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' نے اس سلسلے میں بہت کام کیا۔اب اُردو میں ہر قسم کے مضمون کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

سرسید نے نہ صرف زبان کا ذخیرہ وسیع کیا۔بلکہ اُردو کے ایک نئے اسلوب کو بھی فروغ دیا۔ جس کے بانی مرزا غالب تھے۔اسی اسلوب نے انشائیہ نگاری کے لئے راہ ہموار کی اور سرسید کو اُردو کا پہلا انشائیہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہوا ان کے ایک انشائیے ''اُمید'' کا اقتباس دیکھئے۔

''موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بری ہو انسان کے دل کے مشغلے کو کافی نہیں ہوتی موجودہ رنج وخوشی، محبت ودوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں اس لئے اس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پتلے کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کوئی کمی نہیں ہوتی اور ہمیشہ وہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔

اسی دور میں لکھنؤ میں منشی نول کشور کے پریس اور اخبار ''اودھ پنچ'' نے اُردو زبان وادب کی بہت خدمت انجام دی۔ناول نگاری اور مزاح نگاری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔اس سلسلے میں

عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے نام بہت نمایاں ہیں۔شرر نے بہت سے ناول لکھے جن میں ''فردوس بریں'' کو بڑی شہرت ملی۔ جب کہ سرشار نے فسانۂ آزاد کے نام سے ایک ضخیم ناول لکھا۔جو بہت مقبول ہوا۔

اب جدید اُردو نثر کا عہد آتا ہے جس کی ترقی وترویج میں ''انجمن پنجاب'' کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ انجمن ۱۸۶۵ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔اس کے تحت کئی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ ہوا اس عہد کی اہم شخصیت محمد حسین آزاد ہیں۔

محمد حسین آزاد ایک صاحب طرز انشا پرواز کے طور پر نمایاں ہیں ان کی تصانیف میں متعدد درسی کتب کے علاوہ قصصِ ہند۔نیرنگِ خیال۔سخندان فارس،دربار اکبری اور آبِ حیات شامل ہیں ان کی انشا پردازی کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

''یہ واضح ہو کر سچ خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔اس گھرانے میں حُسن بیان ہوا اس نے ایک اپنے برابر کے خاندان میں شادی کی اس کی دلہن کا نام خندہ جبین تھا۔کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی۔چنانچہ ان کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔''

انجمن پنجاب کے علاوہ انجمن ترقی اُردو۔دارالمصنفین اعظم گڑھ،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ، دارالاشاعت پنجاب دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد دکن وغیرہ اداروں نے اُردو کی بہت خدمت کی۔ ان میں خاص طور پر انجمن ترقی اُردو قابل ذکر ہے۔کہ اس کے زیر اہتمام بے شمار قدیم مخطوطوں کی اشاعت ہوئی۔اس کے سربراہ مولوی عبدالحق خود ایک ممتاز محقق اور ادیب تھے۔

مولوی عبدالحق کے علاوہ اس دور میں ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے اردو نثر کا دامن اپنے، رشحاتِ قلم سے مالا مال کیا ان میں مولوی عبدالماجد دریا آبادی،مصور غم علامہ راشد الخیری،سجاد حیدر یلدرم۔مہدی افادی۔رشید احمد صدیقی،نیاز فتح پوری،شوکت تھانوی،فرحت اللہ بیگ اور پطرس بخاری کے نام نمایاں ہیں،نیاز فتح پور کے ایک انشائیے ''برسات'' میں سے ایک اقتباس۔

''ساون کی وہ سیہ رات۔رات کی وہ امنڈ پڑنے والی تاریکی۔وہ پہاڑوں اور جنگلوں کو ہلا دینے والی اور پھر اس کے تاریک پردے سے فطرت کا وہ زہرہ گداز تبسم برق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب رات کی صبح کبھی نہ ہوگی یہ بارش کائنات کی ہر چیز کو بہالے جائے گی یہ گرج آسمان وزمین کو

پاش پاش کردے گی اور یہ برق تمام عالم کو پھونک کر رکھ دے گی''۔

جدید دور میں اردو نثر میں کئی مستقل اصناف رائج ہو چکی ہیں اور اس لحاظ سے بھی اُردو اب کوئی تہی مایہ زبان نہیں رہی۔ان اصناف میں تنقید،سوانح،ناول،افسانہ،طنز ومزاح،ڈرامہ، انشائیہ سفرنامہ اور خاکہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اُردو تنقید کی رفیع الشان عمارت کا سنگِ بنیاد حالی نے مقدمہ شعروشاعری لکھ کر رکھا ان کے بعد اس کی تعمیر میں جن نقادوں نے حصہ لیا۔ان میں وحیدالدین سلیم۔مہدی افادی۔مولوی عبدالحق کے علاوہ مجنوں گورکھپوری۔نیاز فتحپوری احتشام حسین۔کلیم الدین احمد۔آل احمد سُرور۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم، احسن فاروقی، محمد حسن عسکری، ابو اللیث صدیقی عبادت بریلوی،ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر وحید قریشی،ڈاکٹر سلیم اختر اور جابر علی سید کے نام نمایاں ہیں۔

سوانح نگاری کے میدان میں حالی اور شبلی کے بعد سید سلیمان ندوی عبدالحئی۔عبدالرزاق کانپوری اور ہاشمی فرید آبادی کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

ناول نگاری کے بانی مولوی نذیر احمد کے علاوہ اس صنف کے فروغ میں جن ادیبوں نے خونِ جگر صرف کیا ان میں سرشار،شرر،سجاد حسین،مرزا رسوا،راشد الخیری،پریم چند،سجاد ظہیر،کرشن چندر،عصمت چغتائی،ایم،اسلم،رئیس احمد جعفری،قرۃ العین حیدر،نسیم حجازی،اے آر خاتون،عزیز احمد عظیم بیگ چغتائی اور عبداللہ حسین قابل ذکر ہیں۔

افسانے میں اولیت کا سہرا پریم چند کے سر ہے۔ان کے علاوہ جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کو فروغ دیا ہے۔ان کے نام ہیں،یلدرم،علی عباس حسینی،سدرشن کرشن چندر،منٹو،عصمت بیدی،غلام عباس،ممتاز مفتی،احمد ندیم قاسمی ہاجرہ مسرور،اے حمید،انتظار حسین،مسعود اشعر،عرش صدیقی اور عاصی کرنالی وغیرہ۔

اُردو میں طنز ومزاح کی اولین جھلک مرزا غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔پھر ''اودھ پنچ'' کے ادیبوں نے اسے رواج دیا۔اس کے بعد فرحت اللہ بیگ،رشید احمد صدیقی،عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی،پطرس بخاری،شفیق الرحمٰن کنہیالال کپور،مشتاق یوسفی،کرنل محمد خاں اور مشکور حسین یاد نے اس روایت میں اضافہ کیا ہے۔

اُردو ڈرامے کا پہلا نام امانت لکھنوی ہے۔ان کے بعد پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے اس

صنف کو ترقی دی اس دور کے ڈرامہ نگاروں میں طالب بنارسی ۔احسن لکھنوی اور بیتاب دہلوی قابل ذکر ہیں ۔آغا حشر نے ڈرامے کا ادبی معیار قائم کیا اور ان کے بعد امتیاز علی تاج، مرزا ادیب، آغا بابر، اصغر بٹ، اشفاق احمد، خواجہ معین الدین اور بانو قدسیہ کے نام آتے ہیں ۔

اُردو انشائیے کے بانی سرسید ہیں ان کے علاوہ اس صنف کے فروغ کے لئے جن ادیبوں کی خدمات قابل ذکر ہیں ان کے نام ہیں ۔غلام غوث بیخبر، محمد حسین آزاد، سر عبدالقادر، عبدالعزیز فلک پیما، وزیر آغا اور انور سدید ۔

خاکہ نگاری کی ابتدائی جھلک محمد حسین آزاد کی ''آب حیات میں ملتی ہے دور حاضر میں رشید احمد صدیقی نے گنج ہائے گراں مایہ مولوی عبدالحق نے چند ہم عصر ''چراغ حسن حسرت نے ''مردم دیدہ'' میں دلچسپ خاکے پیش کئے ہیں ان کے علاوہ محمد طفیل، شورش کاشمیری، آغا بابر اور مختار مسعود نے خوبصورت خاکے لکھے ہیں ۔

سفرنامے کی صنف حال ہی میں مقبول ہوئی ہے اور اب یہ مستقل بنیادوں پر قائم ہے ۔اس صنف میں ان اہل قلم نے نام پیدا کیا ہے ۔کمبل پوش محمود نظامی، ابن انشاء، مستنصر حسین تارڑ، حکیم محمد سعید، وجاہت حسین اور بیگم اختر ریاض الدین / یوں اُردو نثر کے ارتقا کا یہ سفر خواجہ بندہ راز گیسو دراز سے ہوتا ہوا دورِ حاضر تک آ پہنچتا ہے ۔اس دوران میں اسے کئی منزلیں طے کرنا پڑی ہیں اور راہ کی دشواریوں اور صعوبتوں سے گزرتے ہوئے اب یہ اس مقام تک آ گیا ہے جہاں مستقبل نہایت روشن اور تابناک دکھائی دے رہا ہے ۔

الحمدللہ اُردو نثر اب اس حد تک پُر مایہ ہے کہ دُنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے خزائن ادب کے سامنے اسے کسی قسم کا احساسِ کمتری محسوس نہیں ہوتا ۔بلکہ وہ ان کے درمیان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے کہ اس کے ارتقا کا سفر اب بھی جاری ہے اور یہی اس کی زندگی کی دلیل ہے ۔

☆☆☆☆☆☆

جدید اُردو نظم

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جہاں برصغیر کی سیاسی اور سماجی فضا میں ایک بیداری پیدا ہوئی ۔وہاں ہمارے ادب میں بھی سرسید کی تحریک کے زیر اثر ایک انقلاب برپا ہوا ۔ہماری شاعری جو زیادہ تر غزل کی روائتی عشقیہ شاعری پر مشتمل تھی، نظم کی طرف بھی توجہ دینے لگی ۔نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری اور میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کی تقلید میں اگر چہ آہستہ آہستہ نظم کا رواج ہو رہا تھا ۔لیکن اس رفتار میں تیزی اس وقت ظاہر ہوئی جب مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے لاہور کی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظم کو فروغ دیا ۔یوں ایک طرف نیچرل شاعری نے ارتقا حاصل کیا تو دوسری طرف جدید شاعری کی بنیاد رکھ دی گئی ۔ان نظموں میں ایک خاص مقصدیت تھی ۔چنانچہ مولانا حالی کی نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' اس جدید رجحان کا نقطۂ عروج ثابت ہوئی ۔اس نظم کا مقصد مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کی یاد دلا کر انہیں ان کی زبوں حالی کا احساس دلانا تھا ۔اکبر الہ آبادی کی شاعری کی روح بھی مقصدی تھی ۔اگر چہ وہ سرسید تحریک کا ردِ عمل تھی ۔لیکن اس دور میں نظم کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال ہیں ۔جنہوں نے اُردو نظم کو ایک وقار اور اعتبار بخشا ۔ان کی شاعری کا مقصد بھی مسلمانانِ عالم کی فکری بیداری تھا ۔جس کے نتیجے میں ان میں سیاسی شعور پختہ ہوا ۔لیکن جدید نظم کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک سے ہوا ۔

۱۹۳۶ء کے قریب اردو شاعری میں بالکل وہی ماحول اور فضا نظر آتی ہے جو امپیریل ازم کے اثرات کے بعد یورپ کی شاعری پر اثر انداز ہوئی ۔اس کا سبب یہ تھا کہ اس دور میں برصغیر کی سماجی حالت بھی یورپی سماج سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی ۔وہی احساس غلامی، سامراجی نظام سے نفرت، مستقبل سے مایوسی، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ردِ عمل، اضطراب، کشمکش اور

بغاوت اور اظہار و ابلاغ میں روائتی تکنیک سے سرکشی کی لہر یہاں بھی موجود تھی۔اس نفسیاتی طرزِ احساس کا اصل محرک تو درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام ہی تھا جس کے تضاد کا ذہنوں میں شدید احساس تھا۔اور شاعر لاشعور کے انتشار میں اس کے اسباب تلاش کرتے تھے۔اس دور کی شاعری میں ایک تکنیکی تبدیلی بھی ظاہر ہوئی۔جہاں پہلے اظہار و ابلاغ کا اسلوب بیانیہ تھا۔وہاں اب تحلیلی اور تجزیاتی صورت اختیار کر گیا۔لیکن اس عہد کی شاعری کا مجموعی تاثر یاسیت اور قنوطیت سے معمور تھا۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک رونما ہوئی۔جس کا مشن ملوکیت اور سرمایہ پرستی کے خلاف جنگ اور انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرنا تھا۔نظم کا رواج اس دور میں عام تھا اور جن نظم گو شعرا نے تحلیل نفسی کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ان میں میراجی، یوسف ظفر، قیوم نظر اور ضیا جالندھری وغیرہ شامل ہیں۔اس دور میں یاسیت کو جس شاعر نے سب سے زیادہ قبول کیا وہ ن۔م۔راشد ہے۔ موضوع پر گرفت اور ڈکشن کی خوبی میں اسے اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ کمال حاصل تھا۔

جن لوگوں نے ماحول سے بغاوت کر کے خارجی ذرائع کا تجزیہ کرنے کی کاوش کی ان میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین، مجید امجد، اختر الایمان اور ظہور نظر کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ بعض شعرا کے اسلوب اظہار پر براہ راست اشتراکی نظریات کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ان میں جوش، فراق علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری اور مجاز شامل ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد اُردو نظم پہلے تو جمود کا شکار ہوئی۔پھر فضا میں مقصدیت پرستی اور ادب برائے زندگی کے نعرے بلند ہوئے اور اس ہنگامے میں وہی لوگ شامل تھے جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تھے۔پھر ۱۹۵۰ء کے قریب کچھ نئی آوازیں سنائی دیں جو نئی نسل کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ان کے موضوعات تو وہی پرانے تھے۔لیکن اُسلوب بیان بالکل نیا اور اچھوتا تھا۔ان نوجوان شاعروں نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دیا۔انہوں نے نہ صرف قدیم موضوعات نئے انداز سے پیش کیے بلکہ زندگی کے جدید تقاضوں کی ترجمانی کا فریضہ بھی انجام دیا۔علاوہ ازیں اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں بہت سے نئے تجربے بھی کیے۔مثلاً بڑے سے بڑے خیال کو کم سے کم لفظوں میں

اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا۔اسی طرح الفاظ میں معنوی وسعت اور تراکیب تشبیہات اور استعارات و علامات میں بھی لچک اور وسعت پیدا ہوئی۔بعض شعرا کے یہاں یاسیت کی بجائے رجائیت کے خوبصورت نمونے اسی دور میں ملتے ہیں۔اس کے علاوہ روایت سے بغاوت کا جذبہ ماحول کو تسخیر کرنے کی کوشش اور انسانی کردار و افعال، جذبات و احساسات اور فطرت کے خارجی حسن کی تحلیل و تجزیہ کی سعی بھی جدید اردو نظم کی خصوصیت ہے۔اس دور کے شعرا میں منیر نیازی، شاذ تمکنت، مصطفیٰ زیدی، بلراج کومل، وزیر آغا، حمایت علی شاعر، جیلانی کامران، سلیم الرحمٰن، افتخار جالب، انیس ناگی، اور عباس اطہر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منیر نیازی کی شاعری میں تلاش کا جذبہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔شاعر اپنے ہمزاد کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ترنم اور تاثیر اس کی نظموں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔وزیر آغا کے یہاں رجائیت واضح اور نکھری ہوئی صورت میں ملتی ہے۔بلراج کومل حصول مسرت کے لئے سماج کے مختلف طبقوں کے ذہنی تجزیئے میں مصروف ہے۔انسان کے خارج اور داخل کا تقابل اور قریبی اشیاء کا مشاہدہ بعض شعرا کے یہاں نئی علامتوں کی شکل میں ابھرتا ہے۔ان میں حمایت علی شاعر، شاذ تمکنت اور مصطفےٰ زیدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔نئی نسل کی سب سے بڑی اور قابل قدر خصوصیت جدید لسانی تحریک ہے۔جس میں بعض شعرا بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔اس تحریک کا مقصد جہاں شاعری کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا کرنا ہے وہاں اس کا ایک اہم مقصد ایک ایسی شعری زبان کی تشکیل بھی ہے جو انسانی زندگی کے روز افزوں پیچیدہ مسائل کا اظہار کر سکے۔اسی طرح اس دور میں کچھ ہیئت کے تجربات بھی اس تحریک کا اہم حصہ ہیں۔

جدید نظم پہلے پابند اور پھر معریٰ اور آزاد صورت میں لکھی گئی۔لیکن اب زیادہ تر آزاد اور کہیں کہیں نثری نظم کی صورت میں بھی لکھی جا رہی ہے۔جدید اُردو نظم کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی علامتی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید نظم کا تناظر بہت وسیع ہے۔یہ ایک ایسے عہد کی پیداوار ہے جس میں قدیم نظام شکستگی سے دوچار ہے اور ایک ایسا نیا جہان ابھر رہا ہے جس کے خدوخال اگرچہ واضح نہیں لیکن جس کی وسعت میں بھی کسی کو شک نہیں۔

اُردو میں مرثیہ گوئی

مرثیہ عربی زبان کے لفظ رثا سے مشتق ہے۔اس کے معنی ہیں مرنے والے کی تعریف و توصیف۔لیکن ادبی اصطلاح میں عام طور پر اس کا مفہوم ایسی نظم ہے جس میں کسی مرنے والے کے فضائل اور اس کی موت پر غم کا اظہار ہوتا ہے۔جہاں تک اس صنف شعر کی ہیئت کا تعلق ہے۔ ابتداء میں اس کی کوئی خاص شکل معین نہیں تھی۔چنانچہ غزل، مثلث مخمس اور مسدس یعنی ہر ہیئت میں مرثیے لکھے گئے۔لیکن بعد میں مسدس کو رواج حاصل ہوگیا اور دوسری تمام ہیئتیں آہستہ آہستہ متروک ہوگئیں۔مسدس کے ہر بند میں پہلے چار مصرعوں میں کسی بات کی تفصیل بیان ہوتی ہے۔ اور آخری دو مصرعوں میں زوردار طریقے سے ان مصرعوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔اردو کے تمام بڑے مرثیہ نگاروں نے مسدس کی ہیت میں مرثیے لکھے ہیں۔

مرثیے کی مختلف قسمیں ہیں۔مثلاً رسمی مرثیہ شخصی اور مذہبی مرثیہ رسمی مرثیہ کے تحت ایسی نظمیں آتی ہیں جنہیں عام طور پر مختلف قومی راہنماؤں کی برسی کے موقع پر لکھا جاتا ہے۔مثلاً ہر سال قائداعظم اور علامہ اقبال کے یوم وفات پر لکھی جانے والی نظمیں، شخصی کسی ایسے عزیز سے متعلق ہوتا ہے۔جس سے شاعر کو جذباتی لگاؤ ہو۔مثلاً اقبال کی نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں اور مذہبی مرثیے کے تحت کسی بھی مذہبی راہنما اور خاص طور پر سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اعزا واقربا اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔انیس اور دبیر کے مرثیے اسی زمرے میں آتے ہیں اور اردو میں عام طور پر مرثیے سے مراد اسی نوعیت کی نظمیں ہیں، اس لئے کہ ہمارے ہاں مرثیہ شہادت امام حسین علیہ السلام اور واقعات کربلا کے بیان ہی سے مخصوص ہے۔

جملہ اصناف سخن میں مرثیے کو چند وجوہ کی بنا پر امتیازی حیثیت حاصل ہے۔مثلاً یہ ایک ایسی مرکب صف سخن ہے۔جس میں قصیدے کی شان وشوکت اور مدح سرائی مثنوی کا تسلسل بیان اور منظر نگاری اور غزل کا تغزل موجود ہے۔لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود مرثیے کا اپنا ایک

انفرادی رنگ بھی قائم رہتا ہے۔دوسرے یہ کہ مرثیہ بیانیہ شاعری کا شہکار ہے اور اس میں جگہ جگہ ایسے اخلاقی نکتے ملتے ہیں۔جن میں نیکی اور ایثار کی تلقین کی گئی ہے۔مثلاً امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے ہمیں یہ عظیما خلاقی سبق ملتا ہے کہ باطل کے خلاف ڈٹ جانا اور حق کی خاطر جان تک قربان کردینا سب سے بڑی نیکی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عرب میں ظہور اسلام سے پہلے بھی مرثیے کہے جاتے تھے۔ایران میں بھی یہی حال تھا۔واقعہ کربلا کے بعد عربی میں پہلا مرثیہ فرزدق اور فارسی میں شیخ سعدی نے کہا۔ ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی کے عہد میں محتشم کاشی کا نام اس سلسلے میں بہت نمایاں ہے۔ برصغیر پاک وہند میں جب اردو زبان تشکیل پذیر ہورہی تھی۔تو دکن پر عادل شاہی فرمانروا حکومت کررہے تھے۔انہی کے عہد میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری نے مرثیے کی ابتدا کی۔ نوری ابوالفضل اور فیضی کا ہم عصر تھا۔اس کے بعد ہاشم علی برھان پوری کا نام آتا ہے۔پھر شاہ فضل اللہ فضلی نے ''دہ مجلس'' لکھی۔انہوں نے واقعات کربلا کو پہلی بار تفصیل کے ساتھ لکھا اور یوں شعرا کے لئے طبع آزمائی کی ایک نئی راہ کھول دی۔فضلی کے بعد دکن میں اس صنف کے ارتقا کے سلسلے میں جن شعرا نے حصہ لیا۔ان میں وجہی، غواصی، لطیف، کاظم، افضل اور ہاشمی قابل ذکر ہیں۔

شمالی ہند میں مرثیے کی ابتدا شہنشاہ ہمایوں کے عہد سے ہوچکی تھی۔شعراء فارسی میں مرثیے لکھتے تھے۔لیکن بعد میں دکنی مرثیوں کے زیر اثر یہاں بھی اردو میں مرثیہ نگاری نے رواج پالیا۔ چنانچہ محمد شاہ کے دور میں مسکین، حزیں اور غمگین نے اس طرف توجہ کی۔ان کے بعد مرزا رفیع سودا نے اس صنف کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔انہوں نے سب سے پہلے مسدس کی ہیئت میں مرثیے لکھے۔اور صرف ہیئت ہی میں نہیں بدلی، بلکہ مرثیے کے اسلوب میں بھی تبدیلی کی۔ان سے قبل مرثیہ نگاری کا صرف ایک مقصد ہوتا تھا کہ شاعر غم حسین علیہ السلام کا اظہار اس طرح کرے کہ خود روئے اور دوسروں کو رُلائے۔لیکن سودا کے مرثیے پڑھ کر رقت طاری نہیں ہوتی۔ البتہ غم والم کی ایک کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے۔ان کے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی
جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے "مجھے ایذادی"
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی
یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی
کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اس کے تو نہیں ڈرتا ہے

شہادت کے واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کے علاوہ سودا نے بعض ضمنی باتوں پر بھی توجہ دی، مثلاً جنگ کی تیاری، صبح کا منظر، گرمی کی شدت، اہل بیت اطہار کا شام کی جانب روانہ ہونا اور دربار یزید میں پیش ہونا، چنانچہ ان کے بعد یہ موضوعات مرثیے کا لازمی جزو سمجھے جانے لگے۔ سودا کے ساتھ مرثیہ گوئی کے میدان میں خلیق اور ضمیر نے بھی شہرت حاصل کی۔ یہ دونوں ایک ہی استاد یعنی مصحفی کے شاگرد تھے۔ خلیق میر حسن دہلوی کے بیٹے اور میر انیس کے والد تھے اور ضمیر مرزا یہ کے استاد تھے۔ خلیق نے بہت سے مرثیے لکھے۔ ان میں جدت بیان۔ شوکت الفاظ اور مبالغہ آرائی ملتی ہے۔ ان کے مدمقابل میر ضمیر کے مرثیے بہت طویل ہیں اور کئی ضخیم جلدوں میں ملتے ہیں۔ انہوں نے چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کے نام سے مرثیے کے اجزا مقرر کئے۔ ان کے بعد دلگیر اور فصیح کا نام آتا ہے۔ پھر مرثیے کے عروج کا دور آتا ہے۔ یعنی انیس اور دبیر کا زمانہ یہ دونوں شاعر تمام مرثیہ نگاروں پر اس طرح چھا گئے کہ ان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا۔ انیس نے شاعری ورثے میں پائی تھی اور مرثیے میں ایسا کمال پیدا کیا کہ یہ صنف سخن صحیح معنوں میں ان پر شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہوگئی۔ ان کے کلام میں فصاحت اور بلاغت ایسی فنی خوبیوں کے علاوہ اثر آفرینی بھی ملتی ہے۔ انہیں مناظر فطرت کی تصویر کشی میں کمال حاصل تھا۔ مثلاً اس بند میں صبح کا منظر دیکھئے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر

اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹے جاتی تھی مہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب باد صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

اسی طرح گرمی کی شدت کے بیان میں اگر چہ اکثر وہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ تاہم فنی لحاظ سے یہ بیان اپنی مثال آپ ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

پانی تھا آگ، گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

منظر نگاری کے علاوہ واقعہ نگاری میں بھی انیس کو کمال حاصل تھا۔ اور اسی خصوصیت نے انہیں مقبول عام بنایا۔ موازنہ انیس و دبیر میں مولانا شبلی نے انیس کو دبیر پر فوقیت دی ہے۔ اگر چہ دبیر کے کلام میں بھی وہ سب خوبیاں موجود ہیں، جو فن شعر کے لئے ضروری ہیں اور جنہیں شبلی نے صرف انیس سے منسوب کیا ہے۔ دبیر کی سب سے بڑی خوبی شکوہ الفاظ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں بعض ایسے استعارے بھی ہیں جنہیں نادر کہا جا سکتا ہے۔ مرزا دبیر کے زور بیاں کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ میدان جنگ میں حضرت امام حسینؑ کی آمد کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
خود عرش خداوند زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

منظر نگاری میں بھی دبیر کسی طرح انیس سے کم نہیں۔ ایک شعر دیکھئے۔

یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جس طرح بھاگیں زلزلے میں چھوڑ کر مکان

اس کے باوجود جو شہرت اور مقبولیت میر انیس کو حاصل ہوئی، دبیر اس سے محروم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو مرثیے کی تاریخ میں انیس اور دبیر کا اپنا اپنا مقام ہے۔ آسمان ادب پر ان کی حیثیت آفتاب و مہتاب کی سی ہے۔

انیس و دبیر کے بعد جن مرثیہ نگاروں نے شہرت حاصل کی۔ ان میں مرزا عشق، مرزا انس، مرزا تعلشق میر نفیس پیارے صاحب رشید اور مرزا اوج کے نام قابل ذکر ہیں، یہ شعرا زیادہ تر انیس و دبیر کی راہوں پر گامزن رہے اور انہوں نے مرثیے کے کینوس میں اگرچہ کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ لیکن مرثیے کے ارتقاء کے سلسلے میں ان کا نام زندہ رہے گا۔

ان شعرا کے بعد حالات زمانہ کے تحت مرثیہ نگاری کا فن کچھ دھندلا گیا، اور بظاہر یوں نظر آتا تھا کہ یہ فن اب کبھی ترقی نہیں کر سکے گا۔ لیکن دور حاضر کے کچھ شعرا نے اس طرف توجہ کی۔ اور اب اس صنف کے فروغ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور مرثیے کے احیاء کا دور ہے اور دور حاضر کے جن شعرا نے اس فن کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا ہے ان میں جوش ملیح آبادی، آل رضا، نسیم امروہوی، نجم فندی، جمیل مظہری پیام اعظمی، قیصر بارہوی آغا سکندر مہدی ڈاکٹر صفدر حسین اور وحید الحسن ہاشمی، شہاب کاظمی اور ساحر لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

اُردو رُباعی

لفظ ''رُباعی'' عربی زبان کے لفظ رُبع سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی چار کے ہیں۔ ادبی اِصطلاع میں رُباعی اُس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل خیال یا مضمون ادا کیا جائے۔ رُباعی کا وزن مخصوص ہے۔ اس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں بھی قافیہ آ سکتا ہے۔ مگر عام طور پر پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ہی قافیے کی پابندی ہوتی ہے۔ آخری دو مصرعے اور خاص طور پر چوتھا مصرع سب سے زوردار ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں اس صنفِ سخن کو ترانہ اور دوبیتی بھی کہا جاتا تھا۔

رُباعی کے موضوعات کا کوئی خاص تعین نہیں کیا جا سکتا۔ شعراء نے اس مختصر صنفِ سخن میں ہر قسم کے خیال اور مضمون کو نظم کیا ہے۔ یہ صنفِ سخن اہل ایران کی ایجاد ہے۔ چنانچہ، فارسی، شعرا میں عمر خیال، سرمد اور ابو سعید ابو الخیر کی رُباعیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری اصنافِ سخن قصیدہ، مثنوی اور غزل کی طرح رُباعی بھی فارسی سے اُردو میں آئی ہے۔

تاریخ ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اُردو رباعی کے ارتقا کو چھ بڑے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر ولی دکنی پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں یہ صنف اپنی ابتدائی صورت میں ترقی کرتی رہی۔ دوسرا دور خواجہ میر درد، مرزا سودا اور میر تقی میر پر مشتمل ہے۔

خواجہ میر درد کی ایک رباعی ہے۔

اے درد یہ درد جی سے کھوتا معلوم
جوں لالہ جگر سے یہ داغ دھوتا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہوتا معلوم

اسی طرح میر تقی میر کی ایک رُباعی ہے۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خوننابہ کشی مدام کی ہے ہم نے

یہ مہلتِ کم کم جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

تیسرے دور میں آتش ، ناسخ ، انشا اور جرات شامل ہیں۔ان کے علاوہ اس دور میں نظیر اکبرآبادی نے بھی رُباعی کی طرف خاص توجہ دی۔اُن کی ایک رُباعی ہے۔

تنہا ہے چراغ دور پروانے ہیں
اپنے جو تھے کل وہ آج بیگانے ہیں
نیرنگیٔ دنیا کا نہ پوچھو احوال
قصے ہیں کہانیاں ہیں افسانے ہیں

چوتھے دور میں میر انیس اور مرزا دبیر قابلِ ذکر ہیں۔انہوں نے بطورِ خاص اس صنفِ سخن کو ترقی دی۔چنانچہ رباعی کی حیثیت اب محض ضمنی صنفِ سخن کی نہ رہی۔بلکہ میر انیس اور مرزا دبیر کی کوششوں سے دوسری اصنافِ سخن کی طرح اسے بھی ایک اہم اور قابلِ قدر صنفِ سخن کا مقام حاصل ہوگیا۔اس دور میں پہلی مرتبہ اُردو رباعی کے مضامین اور موضوعات کا تعین ہوا۔اور عاشقانہ جذبات اور صوفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ رباعی میں خاطر طور پر واقعہ کربلا اور اس سے متعلق باتوں کا ذکر ہونے لگا۔چنانچہ اہلِ بیت اطہار کی مدحت کے علاوہ صبر وشکر، عزم و استقلال، وفاداری، اُخوت، جاں بازی، ایثار وقربانی، حق پرستی، راست بازی اور جہاد کے موضوعات رباعی میں شامل ہوگئے۔اس طرح یہ صنفِ عشق اور تصوف کے محدود دائرے سے نکل کر زندگی کی عام اخلاقی اقدار کی ترجمان بن گئی۔

مرزا دبیر کی ایک رباعی دیکھئے۔

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا
قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کو غریبی ہے دلیل
پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

میر انیس کی ایک مشہور رُباعی ہے۔

پُتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تُو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تُو
نزدیک رگِ گُل سے اس پہ یہ بعد
اللہ اللہ کس قدر دُور ہے تُو

پانچویں دور میں مولانا حالی، اکبرالہ آبادی اور اسمٰعیل میرٹھی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ان شعرا نے اپنی رُباعیوں میں قومی درد اور انسانی ہمدردی کے موضوعات شامل کر کے قومی تعمیر اور اصلاحِ اخلاق کا فریضہ انجام دیا ہے۔

مولانا حالی کی رباعی ہے۔

ہے جان کے ساتھ کام انسان کے لئے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

اسی طرح اکبرالہ آبادی کی یہ رباعی دیکھئے۔

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

چھٹا دور، دورِ حاضر ہے۔اس میں فانی، یگانہ، سیماب، امجد، حیدرآبادی، محروم، جوش اور فراق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فانی کی ایک رباعی ہے۔

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے
کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے

جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی
سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

یگانہ کی یہ رباعی دیکھئے۔

دل کو حد سے سوا دھڑکنے نہ دیا
قالب میں روح کو پھڑکنے نہ دیا
کیا آگ تھی سینے میں جسے فطرت نے
روشن تو کیا مگر بھڑکنے نہ دیا

اسی طرح امجد حیدر آبادی کی یہ رباعی دیکھئے۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لا حول ولا قوۃ الا باللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

ان شعرا کے علاوہ جدید دور کے رباعی کہنے والے شعرا میں وحشت کلکتوی، جگن ناتھ آزاد، ماہر القادری، شاعر لکھنوی، احسان دانش، سیف الدین سیف اور فارغ بخاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

ادیب اور معاشرہ

ادیب کسی بھی معاشرے کا اہم فرد ہوتا ہے اس لئے کہ وہ معاشرہ کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اسکا نقاد اور رہنما بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اور معاشرے کا تعلق لازم و ملزوم کا ہے۔

ادیب کا کسی معاشرے کے بغیر تصور اور کسی معاشرے کا کسی ادیب کے بغیر تصور ناممکن ہے کیونکہ جس طرح کوئی ادیب اپنے معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا اسی طرح کوئی معاشرہ اہلِ قلم اور اہل نظر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ دونوں کی بقا ایک دوسرے کے ساتھ ہے۔

ادیب معاشرے کا ترجمان ہے۔ جس طرح ادب اپنے معاشرے کا عکس ہے۔ اسی طرح معاشرہ ادب کی عکاسی کرتا ہے۔ یعنی صحت مند معاشرے کا ادب بھی صحت مند ہوتا ہے اور بیمار معاشرے کا ادب بھی بیمار خیالات کا حامل، چنانچہ ادیب ایک آئینے کی طرح اپنے معاشرے کی سچی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے یہ تصویر اچھی بھی ہوسکتی ہے اور بری بھی۔ اچھی اس صورت میں کہ معاشرہ اچھا ہو اور بری اس وقت جب معاشرے میں خرابی ہو۔

ادیب چونکہ معاشرے کا ایک فرد اور اس کا ایک جزو ہے اس لئے وہ بھی عام انسانوں کی طرح معاشرے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ عام لوگوں سے زیادہ حساس اور با شعور ہونے کی بنا پر زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ چنانچہ معاشرہ اگر انحطاط پذیر اور رو بہ زوال ہے تو ادیب بھی اسی رنگ میں رنگ جائیگا اور ایسا ادب تخلیق کرے گا جو زندگی سے فرار سکھائے اور اس کے برعکس معاشرہ اگر ترقی پذیر اور رو بہ کمال ہے تو ادیب بھی ارتقا و کمال کا علمبردار ہوگا اور زندگی سے بھرپور ادب تخلیق کرے گا۔

ادب زندگی کی تنقید کا نام ہے۔ چنانچہ ادیب بھی زندگی کی تنقید کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ایک سچا نقاد زندگی کے حسن و قبح کا اظہار بغیر کسی مصلحت کے کرتا ہے اور بے خوفی سے زندگی کا

اصل چہرہ سامنے لانا ہے۔ایک ذمہ دار ادیب کہیں مزاح کے مرہم سے معاشرے کے رستے ہوئے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کہیں طنز کے تیز نشتر سے سماجی برائیوں اور ناہمواریوں کے ناسوروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے، یہ صورت حال پر منحصر ہے۔ادیب کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے افراد کی رہبری اور رہنمائی کرے اور زندگی کی ترتیب وتہذیب اور تعمیر کا فریضہ انجام دے۔ہر معاشرے کا کوئی نہ کوئی آدرش، آئیڈیل یا مثالیہ ہوتا ہے۔ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ اس تک نہ صرف خود رسائی حاصل کرے بلکہ عام لوگوں کو بھی اس کی راہ دکھائے۔

ادیب کا معیار کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اظہار سے دوسروں کو کس حد تک متاثر کرسکتا ہے۔ایک کامیاب ادیب وہی ہے جو قارئین کو متاثر کرسکے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے وہ بھی معاشرے سے اثر لیتا ہے۔لیکن فرق یہ ہے کہ وہ عام انسانوں کی طرح حالات سے متاثر نہیں ہوتا۔بلکہ اس کا احساس اور ردِعمل شدید ہوتا ہے۔جسکا اظہار وہ اپنے فن پاروں میں کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ حال میں زندہ رہتا ہے اور ماضی وحال اور حال ومستقبل میں تعلق استوار کرتا ہے۔

وہ زمانہ حال میں بیک وقت ماضی اور مستقبل دونوں کو روشن دکھاتا ہے۔یہی اس کا کمال ہے شاندار ماضی اور سنہرا مستقبل اس کا سرمایہ ہیں اور اسی سرمائے سے روشنی حاصل کرکے وہ انسانی زندگی کو خوب سے خوب تر کی جستجو کی طرف مائل کرتا ہے وہ ہر قسم کی بدصورتی ختم کرکے زندگی کو خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔وہ اپنی مٹی میں محبت کے پھول اگاتا ہے اور ان کی خوشبو سے ہر قسم کی نفرت وتعصب کے تعفن کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فطری طور پر ایک سچا ادیب اپنی مٹی سے وفادار ہوتا ہے کہ وہ خود اس مٹی کی تخلیق ہے۔یہ وفاداری یوں تو ہر ادیب کی ذمہ داری ہے لیکن ایک نظریاتی معاشرے میں یہ ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کہ اسے جہاں اس نظریئے کے ساتھ مخلص رہ کر اس کے تحفظ کا فریضہ سرانجام دینا پڑتا ہے۔وہاں آنے والی نسلوں کیلئے اس کی تبلیغ وترویج کا بوجھ بھی اس کے شانوں پر آپڑتا ہے۔

ہماری مملکت ایک نظریاتی مملکت ہے ایک سچا ادیب وہ ہے جو اپنے نظریے اور اپنی مٹی سے مخلص ہوا۔اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے نظریۂ حیات کی جدید توجیہہ کرسکتا ہو۔اور اپنی سرزمین کو نظریاتی طور پر دوسروں کیلئے قابلِ رشک بنا سکے یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم اپنے نظریے سے مخلص نہیں ہوں گے یعنی ہم سچے پاکستانی نہیں ہوں گے ہم اپنی سرزمین سے مخلص نہیں ہو سکتے۔صرف اور صرف اسی طرح ہم اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہوکر سرخرو ہو سکتے ہیں۔

اگر ایک ادیب بھی عام آدمی کی طرح سطح پر آکر سوچنے لگے تو اس میں اور عام آدمی میں کیا فرق ہوا۔ادیب کا امتیاز یہی ہے کہ وہ عام انسانوں میں رہ کر بھی ذہنی وفکری طور پر ان سے بہت بلند ہوتا ہے۔اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی اصلاح اور رہنمائی اور اس کی تعمیر وتہذیب کا فریضہ انجام دے۔نہ کہ عام آدمیوں کی طرح خود حالات کی رو میں بہہ نکلے۔جہاں ادیب پر کچھ اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہاں معاشرے کا بھی فرض ہے کہ وہ ادیب کے حقوق پہچانے۔عزت واحترام اسکا حق ہے۔اسی طرح اس کی نگارشات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا فریضہ بھی معاشرے پر عائد ہوتا ہے تاکہ اسکا پیغام ہر فرد تک پہنچ سکے۔

☆☆☆☆☆☆

مرتبہ حسینؑ ادیبوں اور شاعروں کی نظر میں

سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت ایسی عہد آفریں اور تاریخ ساز ہے کہ اس پر جتنا کہا جائے کم اور جتنا لکھا جائے ناکافی ہے۔ چنانچہ حسین علیہ السلام کی بارگاہِ عظمت میں چودہ سو سال سے دنیا کی مختلف زبانوں میں آہوں، سسکیوں اور اشکوں کے نذرانے پیش کئے جا رہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ عربی ادب میں فرزدق اور فارسی میں محتشم کاشی اور مقبل کے مرثیے شہرہ آفاق ہیں۔ برصغیر کی زبانوں ہندی، گجراتی، بنگالی اور پاکستانی زبانوں مثلاً پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی، براہوی، پشتو، پوٹھوہاری، ہندکو اور کشمیری کے علاوہ ہماری قومی زبان اُردو بھی داستانِ کرب وبلا کے خونچکاں بیان سے خالی نہیں، بلکہ اس سلسلے میں دیگر زبانوں کے مقابلے میں اُردو کہیں زیادہ پُر مایہ ہے۔ مرثیہ ہو کہ منقبت، قصیدہ ہو کہ سلام ہمارے یہاں ہر صنف کربلائی ادب کی روشنی سے منور و تابندہ ہے اور سلام اور مرثیہ تو ایسی اصناف سخن ہیں جو حسین علیہ السلام اور کربلا کے بیان ہی سے مخصوص ہیں۔ اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے امام عالی مقام کی بارگاہ میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش نہ کیا ہو اس سلسلے میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں۔ متعدد ہندو شعرا مثلاً ملکھی رام، پنڈت، ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، تلوک مہند محروم، منور لکھنوی اور دلورام کوثری وغیرہ کے نام اس میدان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، شعرا کے ساتھ ساتھ اوباء نے بھی نثر کی مختلف اصناف میں امام عالی مقام کے حضور زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ مضمون نگاروں نے مضمون اور مقالے لکھے تو قصہ نویسوں نے کہانی یا ناول کے انداز میں واقعہ کربلا کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ دکنی عہد کے ادبا سے لے کر عہدِ حاضر کے ادباء مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد خواجہ حسن نظامی، علامہ راشد الخیری، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر کرار حسین نے خاص طور پر تذکرہ حسینؑ سے اپنی تحریروں کو آراستہ کیا ہے۔ کسی نے حسینؑ کو امام حریت کہا ہے تو کسی نے شہید انسانیت کسی نے انہیں کاروانِ عشق الٰہی کا قافلہ

سالار کہا ہے تو کسی نے مظلومیت کا نجات دہندہ کہہ کر حسینؑ کی عظمت و رفعت کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اردو شعراء میں ابتدائی عہد کے دکنی شعرا سے لے کر دورِ حاضر تک کے تمام قابلِ ذکر شعرا نے ذکرِ حسینؑ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ قدیم دکنی شعرا میں وجہی، غواصی، ذوقی اور ولی، شمالی ہند میں مرزا سودا، میر ضمیر، دلگیر، میر خلیق، میر فصیح، میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیے کی شکل میں اسے کمال بخشا، ان کے بعد پیارے صاحب رشید، مرزا اوج، مرزا عشق، علامہ اقبال، ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، ڈاکٹر صفدر حسین اور نسیم امروہوی نے بطورِ خاص بارگاہِ حسینی میں اپنے اپنے اسلوب میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ آیئے ان میں سے چند شعرا کے اشعار کی روشنی میں امامِ عالی مقام کے مرتبے کی جھلک دیکھتے ہیں۔ اُستاد ذوق فرماتے ہیں۔

حُبِ حسینؑ ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حُر
تھا گرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

مرزا غالب کے سلام کا ایک شعر ہے۔

مسیح اخذ کریں جس سے فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو

مرزا عشق امام عالی مقام ل کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

کی جس نے ملکِ صبر کی شاہی حسینؑ ہے
جس نے مدد کسی سے نہ چاہی حسینؑ ہے
باغِ جہاں سے خلد کا راہی حسینؑ ہے
آئی ہے جس کے گھر میں تباہی حسینؑ ہے
مر کے زیادہ قدرِ شہِ نیک خو ہوئی
پیاسے رہے تو پیشِ خدا آبرو ہوئی

میر انیس اور مرزا دبیر تو کربلائی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ان کی تمام تر شاعری کا محور و مرکز ہی ذاتِ حسین علیہ السلام ہے۔میر انیس کی ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے۔

کیا مرتبہ سلطانِ حجازی کا ہے
کیا عز و شرف امامِ غازی کا ہے
سجدے کا نشاں دیکھ کے سب کہتے ہیں
نیزے پہ یہ سر کسی نمازی کا ہے

ان کے ایک مرثیے سے اقتباس دیکھئے۔

پھیلا ہوا تھا دشت میں شاہِ زمن کا نور
حیدرؑ کا فاطمہؑ کا نبیؐ کا حسنؑ کا نور
اک چہرہ حسینؑ میں تھا پنجتنؑ کا نور
چہرے کی ضو بدن کی ضیا اور بدن کا نور؟

گردوں پہ کس طرح مہ و اختر نہ ماند ہوں
اک چاند کے شریک جہاں چار چاند ہوں

مرزا دبیر اپنے اسلوب میں فرماتے ہیں۔

آنکھوں سے عین رعب علیؑ آشکار ہے
سایہ پلک کا سرمۂ دنبالہ دار ہے
گلگو نہ کربلا کی زمیں کا غبار ہے
چہرہ دمِ اخیر گلِ نو بہار ہے
یوں خوش چلے ہیں باغ شہادت کی دید کو
جیسے نبیؐ کے سامنے آتے تھے عید کو

شاعرِ مشرق حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر امامِ عالی مقام کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ان کا یہ شعر تو مشہورِ زمانہ ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اور فارسی میں کس جامعیت کے ساتھ وہ مرتبۂ حسینؑ کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؑ
سروِ آزادے زبستانِ رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

بہر آں شہزادۂ خیر الملل
دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل

سرخرو عشقِ غیور از خونِ او
شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

بہ زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ درویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لاالہ گردیدہ است

جوش دورِ حاضر کے شعراء میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ان کی یہ شہرہ آفاق رباعی حسینؑ کی آفاقیت کو ایک نئے اسلوب میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔فرماتے ہیں۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ
چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

ایک اور مقام پر جوش کہتے ہیں۔

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بہ دم
دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم
اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جسکی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

حسرت موہانی کا ایک شعر ہے۔

امامِ برحقِ اہلِ رضا سلام علیک
شہیدِ معرکہ کربلا سلام علیک

سیماب اکبرآبادی کا یہ انداز ہے۔

یا امام آپ ہیں بے شبہ امامِ عالم
آپ کی ذات سے ہے نظم و نظامِ عالم
یہ فسانہ نہیں ہے نوحہ ٔ عامِ عالم
لے کر سرکار میں آیا ہوں پیامِ عالم

قصہ خواں ہوں نہ ہوں وحشی نہ میں سودائی ہوں
آپ کا خادمِ درگاہ ہوں مجرائی ہوں

مولانا محمد علی جوہر کا یہ مشہور زمانہ شعر کس نے نہیں سنا ہوگا؟

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا ظفر علی فرماتے ہیں۔

کرتی رہے گی پیش شہادت حسین کی
آزادیٔ حیات کا یہ سرمدی اُصول
جڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزید یوں کی اطاعت نہ کر قبول

ابوالاثر حفیظ جالندھری بارگاہِ حسینؑ میں یوں عقیدت گزار ہیں۔

یہ مردِ حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
اُدھر ہزار گھات ہے مگر عجیب بات ہے

کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

فیض عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر ہیں۔سیدالشہداء حضرت امام حسینؑ کے ایک مرثیے میں وہ فرماتے ہیں۔

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیر پھر نعرہ زن و محوِ ثنا ہو گئے شبیر
قربان رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیر خیموں میں تھا کہرام جدا ہو گئے شبیر

مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

احمدندیم قاسمی امام حریت کی شان میں کہتے ہیں۔

یہ شہادت ہے اُس انساں کی کہ اب حشر تلک
آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں

اورآخر میں آغا سکندرمہدی کے مرثیے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

اہلِ ایماں کے لئے قوتِ ایمان حسینؑ
اہلِ تقویٰ کے لئے باعثِ ایقان حسینؑ
اہلِ عرفاں کے لئے مرکزِ عرفان حسینؑ
اہلِ قرآں کے لئے بولتا قرآن حسینؑ

آپ تفسیر بنے آیتِ قرآنی کی
جان کی مال کی ثمرات کی قربانی کی

محمد حسین آزاد کی علمی و ادبی خدمات

مولانا محمد حسین آزاد ایک صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ان کا شمار اُردو نثر کے ارکانِ خمسہ میں ہوتا ہے۔آزاد دہلی میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی محمد باقر تھے۔جنہوں نے ۱۸۳۷ء میں دہلی سے اردو کا پہلا اخبار ''اُردو اخبار'' شائع کیا۔آزاد نے پہلے ان سے اور پھر اُستاد ذوق کے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کی۔بعد میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔جہاں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ اور پیارے لال آشوب ان کے ہم سبق تھے۔۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد مولوی محمد باقر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں مارے گئے تو آزاد دہلی سے نکل کر اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔تلاشِ معاش میں کئی سال مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر ۱۸۶۴ء میں لاہور آئے اور محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ڈائرکٹر تعلیم میجر فلر بڑے علم دوست تھے۔انہوں نے آزاد کو اُردو اور فارسی کی ابتدائی درسی کتابیں لکھنے پر مامور کیا۔میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر ہوئے تو انہوں نے بھی آزاد کی سرپرستی کی۔اور انہیں سرکاری اخبار اتالیق پنجاب کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔کرنل ہالرائیڈ بھی علومِ شرقیہ کے دلدادہ تھے۔انہوں نے ''انجمن پنجاب'' قائم کی۔جس کے تحت طرحی مشاعروں کی بجائے موضوعاتی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ان مشاعروں میں آزاد کے ساتھ مولانا حالی بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔اس طرح جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔اور آزاد اور حالی جدید اردو شاعری کے بانی ٹھہرے۔

آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے اُستاد بھی رہے۔۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انہیں علمی خدمات کے صلے میں انگریزی حکومت کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔حکومت کی جانب سے آزاد کابل اور بخارا بھی گئے۔یوں انہیں جدید فارسی سیکھنے کا موقع ملا۔۱۸۸۹ء میں ان کی جوان بیٹی اچانک وفات پا گئی۔اس صدمے سے ان کا ذہنی توازن قائم نہ رہا۔اور بیس سال تک ان کی یہ حالت رہی۔آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو دنیائے فانی سے

کوچ کر گئے اور کربلا گامے شاہ لاہور میں دفن ہوئے۔

متعدد درسی کتابوں کے علاوہ آزاد کی تصانیف میں آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربار اکبری، سخندانِ پارس، نگارستانِ پارس، قصصِ ہند اور مجموعہ نظم آزاد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آبِ حیات مولانا آزاد کی شاہکار تصنیف ہے۔ جسے اُردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ اُردو شاعری کی پہلی تاریخ ہے جو تذکرہ نویسی کی پرانی روایت سے ہٹ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں ولی دکنی سے لے کر غالب تک تمام اساتذہ سخن کے حالاتِ زندگی ان کے نمونہ کلام اور تبصرے کے ساتھ درج ہیں۔ اِس کے علاوہ اُردو زبان کے ارتقا کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مرقع نگاری کے ایسے عمدہ اور اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ جس کی بنا پر آزاد کا نام ہمیشہ کے لئے تاریخ ادب میں محفوظ رہے گا۔ آزاد کا اسلوب شاعرانہ ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے۔

''نظم اُردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفسِ ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالمِ وجوہ میں آئی تھی۔ مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آکر ایسی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ بدلی''۔

''آبِ حیات'' میں جو لطیفے موجود ہیں۔ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ان سے ہماری شعری تہذیب کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''آبِ حیات مرقع نگاری کا ایک ایسا عمدہ نمونہ ہے۔ جس کی مثال آزاد کے زمانے میں تو کیا بعد کے زمانے میں بھی کم ملتی ہے۔'' ''آبِ حیات'' کے مرقعے یعنی شخصیتوں کی تصویریں۔ مناظر اور تقریبات کی تصویریں اس انداز سے کھینچی ہیں۔ کہ ہو بہو اس موقع، جگہ اور مقام کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے''۔

اور بقول پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔ ''اُردو کیا فارسی میں بھی اعلیٰ پائے کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ یہ اگرچہ تاریخ ہے۔ مگر اس کا ڈھنگ افسانے کا سا ہے اور یہ اگرچہ نثر ہے۔ مگر اس کا لطف نظم کا سا ہے۔''

''دربار اکبری'' معروف مغل فرماں روا اکبر اعظم کے عہد کی تاریخ ہے۔ لیکن یہ ایسی

عبارت میں لکھی ہے کہ کہانی کا لطف آجاتا ہے۔ اس میں عہدِ اکبری کے حالات و واقعات کے علاوہ اس دور کی علمی ترقی کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔

مجموعہ نظم آزاد، مولانا آزاد کی اخلاقی اور قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ تمام نظمیں حسن و عشق کی قید سے آزاد ہیں اور نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔

''سخندان پارس'' دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں فارسی زبان کی اصل اور زبان کی تبدیلی کے اصول وغیرہ تحریر کئے ہیں اور دوسرے حصے میں ایران کی آب و ہوا اور وہاں کی تہذیب و معاشرت نے فارسی زبان اور نظم و نثر پر جو اثرات ڈالے ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ نگارستان پارس بھی فارسی زبان کی تاریخ ہے اور تحقیق سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ ہے۔

قصص ہند، ہندوستان کی تاریخ ہے۔ اس کتاب میں مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کا ذکر کیا گیا ہے۔

''نیرنگِ خیال'' آزاد کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو دو حصوں میں ہے۔ یہ جدید رنگ کی تصنیف ہے جس میں خیالی قصے، تخیل اور استعاروں کی مدد سے عجیب و غریب انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تمثیلی مضامین ہیں جن میں غیر ذی روح اور غیر ذی عقل اشیاء کو جاندار بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ان کے کردار و گفتار سے اخلاقی اصلاح کا کام لیا گیا ہے۔ یہ کتاب آزاد کے خاص اسلوب میں ہے اور ان کے طرزِ تحریر کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ اپنے دلکش انداز بیان اور رمزیت کی وجہ سے نیرنگِ خیال اور ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی اس کا اسلوب نہایت شگفتہ، رواں دواں اور بے ساختہ ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کو دخل نہیں اس کے علاوہ اس میں انشائیے کی بہت سی خصوصیات بھی موجود ہیں۔

آزاد کا شمار جدید اردو شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ لاہور آئے تو انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں میں مولانا حالی کے ساتھ ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے نیچرل شاعری کے تصور کو اردو داں طبقے میں واضح کیا۔ اور ایسی نظمیں لکھیں جن کے موضوعات اخلاقی، اصلاحی اور فطرت سے متعلق تھے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ چنانچہ ان کی نثر پر بھی ان کی شعریت کا گہرا اثر ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں عموماً منظر نگاری اور زورِ کلام کو جس

انداز سے نبھایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے ۔ان کی یادگار نظمیں شب قدر، صبحِ امید، حب وطن، ابرِ کرم، دادِ انصاف اور خوابِ امن ہیں ۔جن میں ان کے اسلوبِ شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں ۔

سرسید نے ادب کی اصلاح کی جو تحریک چلائی ۔آزاد اگر چہ اس سے براہِ راست وابستہ تو نہ تھے ۔لیکن اس سے پیدا شدہ علمی وفکری فضا سے متاثر ضرور تھے ۔چنانچہ انہوں نے بحیثیت نقاد جو خدمات انجام دیں، ہمارے تنقیدی ادب میں اس کا اپنا ایک مقام ہے ۔ان کی تنقید زیادہ تر مشرقیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے ۔حالانکہ وہ مغربی افکار وخیالات سے بھی بہت حد تک آشنا تھے ۔ان کے تنقیدی نظریات تخندانِ پارس، نگارستان اور دیوانِ ذوق کے مقدمے میں ملتے ہیں، لیکن تنقیدی لحاظ سے آبِ حیات ان کی سب سے اہم کتاب ہے ۔اس کتاب میں اگر چہ قدیم شعرا کا تذکرہ لکھا گیا ہے ۔لیکن اس طرح کہ پرانی روش سے ہٹ کر شعرا کے کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے ۔

آزاد کا شمار اُردو کے بہترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے ۔ وہ صاحبِ طرز ہیں ۔ان کا اسلوبِ نگارش ایسا منفرد اور ممتاز ہے کہ آج تک کوئی ادیب اس کا تتبع نہیں کر سکا ۔آزاد کے طلسماتی اسلوبِ تحریر کی خصوصیات میں شعریت لفظی صنعت گری، شوکتِ الفاظ، لطافتِ زبان، مرقع نگاری، تخیل پرستی شگفتگی اور مرصع کاری شامل ہیں ۔ان کی تحریر میں طنزیہ اور مزاحیہ عناصر بھی ملتے ہیں ۔لیکن ان کی طنز نشتریت کی بجائے شائستگی اور تہذیب کا نمونہ ہے ۔ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی وہ دلچسپی ہے جو ہر جگہ موجود ہے اور قاری کہیں اکتاہٹ یا بیزاری کا شکار نہیں ہوتا ۔مولانا آزاد کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی لکھتے ہیں ۔

مولانا آزاد اپنے دور کے سب سے بڑے مینا کار اور مرصع نگار ہیں ۔اس وصف میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ۔زبان کی نزاکت، بیان کی لطافت، تشبیہہ واستعارہ کی رنگینی اور تراکیب کی شگفتگی جس قدر آزاد کے یہاں قدم قدم پر ملتی ہے ۔دوسرے نثر نگاروں کے یہاں ملنا مشکل ہے ۔وہ اس انداز سے چھوٹے چھوٹے چبھتے ہوئے فقرے تراشتے ہیں کہ ان کو آذرِ سخن کا لقب زیب دیتا ہے ۔"

بقول مہدی افادی "سرسید سے معقولات کو الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے ۔نذیر احمد مذہب کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے ۔شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے ۔حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں ۔مگر آقائے اُردو پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں ۔جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ۔

حرف حرف تیشہ

"حرف حرف تیشہ" خمار انصاری کا مجموعہ کلام ہے جس میں ان کی غزلیں اور قطعات و رباعیات شامل ہیں ۔پیش لفظ مشفق خواجہ نے لکھا ہے جب کہ فلیپ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور اختر انصاری اکبر آبادی کی آرا تحریر ہیں ۔اس کے علاوہ خود صاحبِ کتاب نے بھی "حرف آخر" کے عنوان سے کتاب کے آخر میں شعر وسخن کے بارے میں اپنا نظریہ اور اپنی شاعری کا پس منظر بیان کیا ہے جس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے ۔خمار انصاری بقولِ خود اس گروہ بندی، پروپیگنڈے اور جوڑ توڑ کے زمانے میں مزاجاً گوشہ گیر اور کم آمیز انسان ہیں ۔چنانچہ خاموشی سے خدمت شعر وادب انجام دے رہے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ عرصہ تیس سال سے شعر کہنے کے باوجود یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے ۔

وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں مگر روائت سے ان کا تعلق اتنا ہی ہے جتنا درخت کی شاخوں کا اپنی مٹی سے ہوتا ہے ۔یعنی انہوں نے روائت سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے روحِ عصر کو اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے ۔ ادب کا زندگی اور کائنات سے جو رشتہ ہے اس کا اظہار ان کے اشعار میں جگہ جگہ ہوا ہے ۔وہ شاعری کو نری موزونیت نہیں سمجھتے بلکہ حسنِ بیان اور ندرتِ افکار کے بھی قائل ہیں اور شعر ان کے نزدیک روح کی آواز اور دل کی صدا ہے ۔

دنیا نے جسے شعر سے تعبیر کیا ہے
وہ روح کی آواز ہے وہ دل کی صدا ہے

یہی روح کی آواز اور دل کی صدا جب حرفوں میں ڈھلتی ہے تو ایک ایک حرف تیشے کا کام دیتا ہے ۔شاعری کوہ کنی کا فرض ادا کرتی ہے اور یوں شعر کا پیکر جمیل ظہور میں آتا ہے ۔"حرف حرف تیشہ" کا شاعر بھی ایسا ہی کوہ کن ہے جو لفظوں کے پیکر تراشتا ہے ۔بقول مشفق خواجہ "خمار عام غزل

گوشاعروں کی طرح بے روح لفظوں کی دکان نہیں سجاتے ۔انہیں معلوم ہے کہ شاعری میں لفظ کی معنویت اس معنویت سے مختلف ہوتی ہے جو لغت میں نظر آتی ہے ۔وہ ہر لفظ کی روح میں اتر کر لفظ و معنی کے ربط و تعلق کو دریافت کرتے ہیں ۔

لفظ جب تک زینت فرہنگ تھا کچھ بھی نہ تھا
فن کی حد میں لفظ کی وسعت کا اندازہ ہوا

اس شعری مجموعے کے مطالعے کے بعد جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خمار انصاری ایک مشاق اور پر گو شاعر ہیں ۔انہوں نے متعدد اور مختلف بحروں میں شعر کہے ہیں ۔ان کے کلام میں کہیں ناہمواری محسوس نہیں ہوتی اور وہ احساس اور خلوص کی دولت سے مالا مال ہیں ۔ذات کے ساتھ کائنات اور غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا ذکر بھی ان کے ہاں ملتا ہے بلکہ یہ رنگ کچھ زیادہ نمایاں ہے چنانچہ اپنے اشعار کے ذریعے انہوں نے اپنے عہد کے آشوب کا جس کامیابی سے اظہار کیا ہے اس میں حسنِ بیاں بھی ہے اور ندرتِ فکر بھی ،ملاحظہ کیجئے ، یہ چند اشعار

اشکوں کی قیمت ہی کیا ہے
جھوٹے موتی، ٹوٹے تارے

لوگ پڑھتے ہی نہیں ہیں ورنہ
درد چہروں پہ رقم ہوتے ہیں

شعر وہ شعر ہی نہیں ہے خمار
جس میں عکسِ رخِ حیات نہیں

دل کو یوں چھو کے تری یاد چلی جاتی ہے
جیسے گزرے کوئی رہرو کسی ویرانے سے

اس مجموعے میں غزلوں کے علاوہ چند قطعات و رباعیات بھی شریک ہیں جو شاعر کی ہنر مندی اور فنی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔مثال کے طور پر ایک قطعہ اور رباعی ملاحظہ فرمایئے ۔

کئی شعلے بھڑک کر رہ گئے ہیں
کئی جگنو چمک کر رہ گئے ہیں

بہت مشکل ہے منزل تک پہنچنا
بہت سے لوگ تھک کر رہ گئے ہیں

اور

احساس میں شعلوں کی لپک ہوتی ہے
آواز میں نیزوں کی کھنک ہوتی ہے
انسان کی عظمت کو جب آتا ہے جلال
یزداں کے سینے میں بھی دھمک ہوتی ہے

غرض خمار انصاری کا حرف حرف تیشہ ایک ایسا متوازن شعری مجموعہ ہے جسے آج کے زندگی آمیز ادب میں ایک خوش گوار اضافہ کہا جا سکتا ہے ۔

☆☆☆☆☆

نئے ذائقے

''نئے ذائقے'' اردو اکادمی ملتان کے تنقیدی جلسوں میں پڑھے جانے والے مختلف تنقیدی مقالات ومضامین کا انتخاب ہے جس میں ملتان کے تقریباً تمام قابل ذکر مقالہ نگاروں کی نمائندہ تحریریں شامل ہیں اور اسے سید ریاض زیدی اور فیاض تحسین نے مرتب کیا ہے۔

کتاب کے پہلے مقالے ''تخلیقی عمل'' میں عرش صدیقی نے کچھ بنیادی سوالات اٹھائے ہیں۔ مثلاً تخلیقی عمل کیا ہے؟ اور ذہن انسانی میں افکار وخیالات کہاں سے اور کیونکر آتے ہیں؟ اور کیسے تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں؟ اور کیا تخلیقی عمل اپنے اردگرد سے بے نیاز ہے؟ اور کیا صرف ذہن انسانی کو فن یا تخلیق کا خودمختار منبع ومخرج قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان کے نزدیک تخلیقی عمل ایک رد عمل ہے اور اس میں شعور ولاشعور برابر کے حصہ دار ہیں اور سچے اور اچھے فنکار کی تخلیقی قوت اور سچے اور اچھے سائنسدان ریفارمر یا فلسفی کی تخلیقی قوت کی اصل ایک ہے اور ان سب کے ذہنوں میں ہونے والے تخلیقی عمل کے بنیادی اصول ایک ہی ہیں عرش صاحب نے اپنے موقف کی متعدد مثالوں سے وضاحت کی ہے۔ مگر اختلاف کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔

سید قدرت نقوی نے ''اردو مرثیہ پر ایک نظر'' کے تحت نہایت بلیغ پیرائے میں قدیم جدید مرثیے کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ بیان کر دی ہے جو ان کے تبحر علمی اور تعمقِ فکری کی دلیل ہے۔

اس طرح ابن حنیف نے اپنے مقالے ''مصر کی قدیم رومانی شاعری'' میں خاصی محنت اور جستجو سے کام لیا ہے ان کا یہ مقالہ ہر لحاظ سے تحقیقی اور معلوماتی ہے اور تحقیقات سے ان کی دلچسپی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ البتہ جگہ جگہ اقتباسات کی بھرمار اور کہیں کہیں تکرار نے اس کے مجموعی تاثر کو قدرے کم کر دیا ہے۔

سلیم اختر نفسیاتی تنقید میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کا مقالہ ''ادب ..... بزعیست کے آئینے میں'' انکی وقت نظری اور ژرف نگاہی کی روشن دلیل ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے

کامیاب ہے۔

عین الحق فرید کوٹی نے اپنے مضمون میں سنسکرت اور پراکرتوں کے باہمی تعلق کو موضوع بحث بنایا ہے۔ انہوں نے اس قدیم لسانی مفروضے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنسکرت ایک نہایت شدھ زبان ہے اور تمام غیر آریائی یعنی مقامی زبانوں سے مبرا ومنزہ ہے۔

فرخ درانی نے ادب میں ابلاغ کا مسئلہ چھیڑ کر اظہار وابلاغ کا فرق نمایاں کیا ہے ان کے نزدیک اظہار فنکار کا اور ابلاغ قاری کا مسئلہ ہے مگر ابلاغ بھی ثانوی لحاظ سے فنکار ہی کا مسئلہ ہے کہ اس کے لیے تسکین وترفیع ذات کا ذریعہ ہے گویا اظہار فن کار کا فرض اور ابلاغ فن کار کی خواہش ہے ابلاغ کے اس مسئلے نے انہیں کچھ الجھا دیا ہے اور یوں اس مقالے میں بھی ''ابلاغ'' کا مکمل ابلاغ نہیں ہو سکا۔

نذیر احمد نے جنس اور ادب کے تحت ایک فکر انگیز بحث کی ہے ان کے خیال میں جنس اور اس سے پیدا شدہ الجھنیں نہ صرف محرک تخلیق بنتی ہیں۔ بلکہ بیشتر ادبی کش مکشوں کی تہہ میں یہی الجھنیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اے بی اشرف نے اپنے مضمون میں پریم چند کے ناولوں پر اشتراکی انقلاب کا اثر واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

شمیم ترمذی نے ''غالب ایک نفسیاتی تجزیہ'' میں غالب کے فن شخصیت اور اس کے دور کا تجزیہ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اسی طرح سلطان صدیقی نے ''نظیر کی ترقی پسندی'' کے جواز میں اس کی عوامی نظموں سے اقتباسات پیش کر کے نظیر کی پُرگوئی ہمہ جہتی اور بوقلمونی کا اظہار کیا ہے۔

یحییٰ امجد نے غزل کا تخلیق سے تحسین تک کا سفر بڑے شاعرانہ اسلوب میں بیان کیا ہے لیکن شعری اقتباسات پیش کرتے وقت انہوں نے کئی مقامات پر معروف ناموں کی بجائے نسبتاً گمنام لوگوں کو نمائندگی دے دی ہے۔

ریاض زیدی نے ''فکرِ اقبال، چند رخ'' کے عنوان سے کلام اقبال میں انسانی فضیلت و

عظمت کا سراغ لگایا ہے۔آخر میں میں اس مجموعے کے سب سے اہم مضمون پر اظہار خیال کروں گا اور وہ ہے مسعود اشعر کا مضمون 'نئے ذائقوں کے زخم' میرے نزدیک یہ مضمون کتاب میں سب سے زیادہ دقیع اور خیال انگیز ہے اور مقام کے اعتبار سے اُسے مجموعے کی ترتیب میں پہلا درجہ حاصل ہونا چاہیے تھا۔ویسے اس کتاب کا نام بھی اسی مضمون کے عنوان سے ماخوذ ہے، اشعر صاحب نے اس بسیط مضمون میں نئی شاعری اور نئے افسانے کے حوالے سے جدید طرز احساس کو سمجھنے اور سمجھانے کی پرخلوص کوشش کی ہے۔نئے ادب میں جو یک منظری اکتاہٹ، انتشار ذات اور عدم تحفظ کا احساس نمایاں ہے۔اس نے تخلیقی طور پر پیچیدگی، تشکیک اور بے مقصدیت کی شکل اختیار کر لی ہے ان کے نزدیک نیا شاعر اور نیا ادیب بیک وقت اپنی پیچیدہ اور واضح ذات کو پیش کرنے کے لیے نئی زبان اور نئے اسلوب کی تلاش وجستجو میں ہے اور یہ نیا طرز اظہار ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندانہ ادب کے خلاف ایک ذہنی ردعمل ہے۔اشعر صاحب کا یہ مضمون اپنی زبان اور طرز بیان کے اعتبار سے بھی ایک خوبصورت دلچسپ اور زندہ تحریر ہے۔

مجموعی طور پر ''نئے ذائقے'' اُردو اکادمی ملتان کی ایک معیاری ادبی اور فکری پیش کش ہے اور امید ہے کہ اس کے مندرجات اپنی ثقاہت اور متانت کی بنا پر اُردو کے علمی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

کروٹ کروٹ خوشبو

ماجد صدیقی پنجابی کے معروف شاعر ہیں، مگر اردو کے نوجوان غزل گو شعراء میں بھی ان کا اپنا ایک مقام ہے۔یہ مجموعہ جوان کی صرف اردو غزلوں پر مشتمل ہے، اپنے نام میں بھی ایک خاص انفرادیت اور ایک معنی خیز دلکشی رکھتا ہے۔کتاب کے آغاز میں ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے ماجد کی غزل گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے ریاض مجید لکھتے ہیں۔

''ان غزلوں کی ایک نمایاں صفت ماجد کا متوازن طرز احساس اور اس کا اظہار ہے۔اس کے ہاں زندگی کے دکھوں کا اظہار بھی ہے اور زندگی کی سیاہ رات میں کہیں کہیں ملنے والی جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی خوشیوں اور لذتوں کا ذکر بھی''

ہمارے خیال میں ماجد کی غزلوں میں غم سے زیادہ خوشی اور افسردگی سے زیادہ شگفتگی کا احساس نمایاں ہے۔وہ تجربات حیات کے تلخ وترش ذائقوں کی جگہ زیادہ تر شیریں ذائقوں کا شاعر ہے۔اگر چہ زندگی میں خوشی کا احساس وقتی اور لحاتی ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں غم والم کی کیفیت دیرپا بلکہ دائمی حیثیت رکھتی ہے لیکن زندگی میں خوشی کا مقام بھی بہرحال اپنی جگہ پر ہے اسی احساس سے جائیت پسندی جنم لیتی ہے جو زندگی کی تعمیر وتزئین کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہے ماجد کے ہاں رجائیت کا عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ وہ دکھوں میں بھی اپنے لئے راحت کا سامان مہیا کر لیتا ہے۔غموں کے ہجوم میں بھی خوشی کا پہلو تلاش کرتا ہے یہی اس کی انفرادیت ہے اس کی رجائیت میں حقائق کی نفی اور پیرنگی کی کیفیت نہیں، بلکہ ایک قسم کی تازگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ تازگی مثبت اور صحت مند اقدار حیات کو فروغ دیتی ہے۔اس کے یہ شعر دیکھئے۔

جھڑتا ہے کوئی پھول تو رو دیتے ہو ماجدؔ
جینا ہے تو کھلتی ہوئی کلیوں کو بھی دیکھو

نکلا ہے اُدھر چاند، ادھر سوچ میں گم ہو
جیتے ہو تو جیتے ہوئے لمحوں کو بھی دیکھو

ہم ہیں ماجدؔ سلگتے دیئے رات کے
بجھ گئے بھی تو ہو گی سحر سامنے

ہمیں پہ ختم ہے افسردگی بھی پر ماجدؔ
کھلائیں پھول چمن میں جو مسکرائیں کبھی

جھڑنا نہ دیکھ شاخ سے پتوں کو ہی فقط
ماجدؔ شگفتِ موسم گل کا سماں بھی دیکھ

اوراس کا یہ مصرع

ع: ماجدؔ یہ زندگی تو عبارت ہُمک سے ہے

اس کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا منہ بولتا ثبوت ہے

اکثر نئے شاعروں کے برعکس ماجدؔ کی بیش تر غزلوں کے مطلعے رواں دواں اور بے ساختہ ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس نے جدید ہوتے ہوئے بھی روایت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔یہ مطلع دیکھئے۔

مہک اٹھیں یہ فضائیں جو لب ہلائیں کبھی
ہمیں بھی چھیڑ کے دیکھیں تو یہ ہوائیں کبھی
تنہا نہ رہو شہر میں اوروں کو بھی دیکھو
روتوں سے نکل پاؤ تو ہنستوں کو بھی دیکھو

ماجدؔ کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت ان کی چھوٹی بحریں بھی ہیں۔ناصر کاظمی اور باقی صدیقی کی طرح ماجد دیقی نے بھی چھوٹی بحروں کو زیادہ استعمال کیا ہے ان بحروں کی افادیت مسلم ہے اور ماجد نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کہیں کہیں ماجد کے شعروں کی زبان کچھ اکھڑی اکھڑی بھی نظر آتی ہے چنانچہ ایسے مواقع پر اس کا اسلوب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔غالباً ایسے اشعار شاعر کی ابتدائی مشق کا نتیجہ ہیں جنہیں اس مجموعے میں شامل نہیں ہونا چاہئے تھا۔اسی طرح اس کی بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جو صرف تین شعروں پر مشتمل ہیں اور بعض نو دس اشعار سے بھی زیادہ کی ہیں۔یہ افراط وتفریط کچھ اچھی نہیں لگتی یوں بھی کوئی شعری مجموعہ ترتیب دیتے وقت اگر کڑا انتخاب کر لیا جائے تو اس صورت میں وہ شاعر کے فن کا زیادہ نمائندہ اور بہتر معیار کا حامل ہوگا۔

بہرحال کروٹ کروٹ خوشبو، نئی اردو غزل کے رنگا رنگ گلدستے میں ایک خوشبودار اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆

ادب اور جدلیاتی عمل

''ادب اور جدلیاتی عمل'' پروفیسر سجاد حارث کے سلہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ان مضامین کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں ۔ادب اور جدلیاتی عمل ،عبداللہ حسین اور اداس نسلیں ،ادب میں مسیحائی کا مسئلہ۔مرزا ادیب کے یک بابی ڈرامے ۔رقص کے قدیم روپ اور ڈرامہ،ایک روشن ضمیر امریکی شاعر ،راشد کے خطبہ صدارت پر ایک تنقیدی نظر ،ژاں پال ،سارتر ،اشتراکی ،حقیقت نگاری ، اردو زبان کا لوک شاعر نظیر اکبر آبادی ،منور خاں دلمیر ایک عوامی شاعر ، شاعری میں موضوعاتِ مرگ کی نیرنگیاں ،ادب میں بورژوا تصورات ، یادوں کی برات پر چند تاثرات ،جدید اردو شاعری میں بغاوت کی روایت اور شاعر ،اجتماعی انسان اور شاعری چنانچہ ان عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مضامین متنوع موضوعات کے حامل ہیں ۔سجاد حارث ایک ترقی پسند نقاد ہیں، چنانچہ ان مضامین انہوں نے سائنسی اور تاریخی اندازِ فکر کے ساتھ زندگی اور ادب کا ایک ترقی پسند نظریہ اپنانے کی کوشش کی ہے ۔ان مضامین میں ان کا ایک واضح نظریاتی موقف ہے کہ انہیں شخصیات سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی ان شخصیات کی تحریروں اور تخلیقات اور ان کے نظریاتی مواد سے ہے ۔چنانچہ ایک روشن ضمیر امریکی شاعر ۔ژاں پال ،سارتر ،اردو زبان کا لوک شاعر نظیر اکبر آبادی منور خاں دلمیر ایک عوامی شاعر اس ضمن میں آتے ہیں ۔ایک روشن ضمیر امریکی شاعر کے زیر عنوان انہوں نے والٹ وہمٹین کی شخصیت اور شاعری کا تعارف کرایا ہے ۔''ژاں پال سارتر'' میں نہوں نے فرانس کے معروف ادیب اور مفکر سارتر کی ذات اور اس کے فلسفہ وجودیت پر کھل کر بات کی ہے ۔اسی طرح اردو زبان کا لوک شاعر نظیر اکبر آبادی کے عنوان سے انہوں نے نظیر کے عہد کی مخصوص صورت حال میں نظیر کی شاعرانہ شخصیت اور ان کی فنی عظمت کا جائزہ لیا ہے ۔اس طرح منور خاں دلمیر ایک عوامی شاعر'' کے تحت انہوں نے غالب مومن اور ذوق کے ہم عصر شاعر منور خاں دلمیر کی دہقانی زبان کی شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے

اور اس کی دلچسپ زبان کے نمونے بھی پیش کیے ہیں ۔مثلاً دلمیر کی ایک مسدس ''روپیہ کی تعریف میں سے ایک بند ملاحظہ فرمائیں ۔

یو ہی روپیہ باپو پوت　　یوہی روپیہ مہا سپوت
یوہی روپیہ ائم ادت　　یو ہی روپیہ پوت کپوت
باہن کو اے نہ بھیا ہے　　سب کا رام روپیا ہے

(یعنی یہی روپیہ باپ اور بیٹا ہے ۔یہی روپیہ نبات صالح فرزند ہے ،یہی روپیہ احمق نہایت احمق ہے ،یہی روپیہ لائق فرزند ہے نہ کوئی بہن ہے نہ بھائی ہے ،سب کا خدا روپیہ ہے)

غالباً دلمیر کو اردو ان طبقے میں متعارف کرانے کے لئے ان کی شاعری پر یہ پہلا تنقیدی مضمون ہے اور اس اولیت کا سہرا بجا طور پر سجاد حارث صاحب کے سر ہے ۔

ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے فن اور شخصیات کے موضوع پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے لیکن اس کتاب میں ایسے موضوعات پر بھی چند اچھے مضامین ملتے ہیں ،مثلاً عبداللہ حسین اور اداس نسلیں ''مرزا ادیب کے یک بابی ڈرامے' اور راشد کے خطبہ صدارت پر ایک نظر'' یادوں کی بارات پر چند تاثرات اور شاعر ،اجتماعی انسان اور شاعری ، ہم عصروں کے بارے میں لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے لیکن ان مضامین میں سجاد جارث نے اپنے ہم عصروں عبداللہ حسین ، مرزا ادیب ، راشد جوش اور حمایت علی شاعر کے فن اور شخصیت کو نہایت سلامت روی کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے ۔اسی طرح ''ادب اور جدلیاتی عمل'' ادب میں مسیحائی کا مسئلہ رقص کے قدیم روپ اور ڈرامہ اشتراکی حقیقت نگاری ، شاعری میں موضوعاتِ مرگ کی نیرنگیاں ۔ ادب میں بورژوا تصورات اور جدید اردو شاعری میں بغاوت کی روایت ترقی پسند رجحانات اور اشتراکی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں اور ان تمام مضامین کی زبان فکری متانت اور علمی وقار کی مظہر ہے مختصراً فکر و نظر کے اعتبار سے ''ادب اور جدلیاتی عمل'' ہمارے تنقیدی ادب میں ایک خوشگوار اور گراں مایہ اضافہ ہے ۔

عرفانِ جمیل

''عرفان جمیل'' پروفیسر جمیل مظہری کے مراثی وقصائد کا مجموعہ ہے۔ اردو میں انیس ودبیر کی کلاسیکی روایت کے بعد جدید مرثیے نے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ اور آج کے دور میں بھی مرثیہ زندہ اور توانا ہے۔ جدید مرثیے کے معماروں میں جہاں آغا سکندر مہدی، ڈاکٹر سید صفدر حسین نسیم امروہی، آلِ رضا، نجم آفندی اور جوش ملیح آبادی قابلِ ذکر ہیں۔ وہاں جمیل مظہری کا نام بھی آتا ہے۔ ''عرفانِ جمیل میں ان کی چند رباعیوں اور سلاموں کے علاوہ ۱۹۰۳ سے ۱۹۶۳ء تک لکھے ہوئے ان کے چھ مرثیے اور چھ قصیدے شامل ہیں۔ یہ مرثیے ''عرفانِ عشق'' پیان وفا' عزمِ محکم' ''مضراب شہادت'' افسانۂ ہستی، اور شامِ غریباں، کے عنوانات کے تحت شہادت امام عالی مقامؑ، سفر جناب امامؑ شہدائے کربلاؑ حضرت عونؑ ومحمدؑ اور حضرت زینبؑ کے احوال پرمبنی ہیں اس طرح قصائد میں تین نعتیہ ہیں ایک قصیدہ حضرت علیؑ کی مدح میں ہے۔ ایک قصیدے میں مرزا غالب اوران کے ممدوح حضرت علیؑ دونوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور آخری قصیدہ غالب کے مشہور قصیدے ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' کی مخمس کی صورت میں تضمین ہے۔

جمیل مظہری کے مرثیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب بیان انیس، غالب اور اقبال سے ملتا ہے۔ کتاب کے شروع میں بہ سبیل تذکرہ کے عنوان سے ڈاکٹر سید صفدر حسین نے مصنف کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جناب جمیل مظہری کو اپنے خاندانی اثرات کے تحت مرثیہ نگاروں کے دونوں معروف دبستانوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ان کے آغازِ شعور ہی سے ان کے خاندان کے اندر اور خاندان کے باہر تمام ملک میں چونکہ میر انیس کا سکہ رواں ہو چکا تھا اس لئے ان کے مذاقِ سلیم کی پرداخت میں انیس کے رنگِ کلام کا بڑا حصہ ہے''

اسلوب بیان کے علاوہ ان کے موضوعات میں بھی قدیم اجزاء کے ساتھ ساتھ ہمیں جدید عہد میں حیات وکائنات کے متنوع مسائل کی گرہ کشائی ملتی ہے۔ یوں مظہری صاحب نے ہماری نئی نسل کے لئے مرثیے کے جدید امکانات کی نشاندہی کرکے اس صنف کا فنی وقار بحال کرنے کی

کوشش کی ہے ان کے ہاں مرثیت کی مخصوص فضا کے ساتھ ساتھ جدید فکر کی پختگی بھی برقرار رہتی ہے گویا جدید سیاسی، سماجی اور نفسیاتی شعور کے ساتھ ان کے یہ مسدس مرثیہ کا دبدبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قدیم وجدید دونوں مکاتبِ فکر کے لئے یہ قابلِ توجہ ہیں۔

اردو کی مذہبی قصیدہ نگاری میں منیر شکوہ آبادی امیر مینائی، محسن کاکوروی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی کے نام نمایاں ہیں، جمیل مظہری کے مذہبی قصائد ان اساتذہ فن کے قصائد کے مقابلے میں برتر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ ان کی یہ مدحیہ نظمیں ان کے عمیق مشاہدے، وسیع تجربے، شگفتہ اسلوب بیان اور فنی پختگی کی بنا پر اہم ادبی کاوشیں ہیں۔ آخر میں بطورِ نمونہ ان کے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ وارث میراث خلیل
خالق جذبہ قربانی و روحِ تعمیل
اس کی سیرت ہوئی ایک فطرتِ کبری کی دلیل
جس سے دیکھی نہ گئی نوعِ بشر کی تذلیل
جس نے انسان کو پستی سے ابھارا وہ حسینؑ
جس کے تیور تھے مشیت کا اشارا وہ حسینؑ

ایک رباعی ہے

اے خالق ارض زندگی پیدا کر ذرات میں اوجِ سرمدی پیدا کر
مٹی کو پلا چکا ہے خون شبیر اب تو مٹی سے آدمی پیدا کر

اسی طرح سلام کے یہ دو شعر دیکھئے۔

امامت کی جو منزل تھی سمجھ میں آ گئی سب کے
شہادت کا جو مقصد تھا وہ کب دنیا نے پہچانا
حاصلِ طاعت کونین ہے بے شک وہ نماز
جو ادا بھی نہ ہوئی اور قضا بھی نہ ہوئی

صورت گر

''صورت گر'' مظہر عباس انصاری کے چار ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل ہے۔اصناف ادب میں ڈرامے کی حیثیت نمایاں ہے اور ڈرامے کا ارتقاء سالہا سال کی کوششوں پر محیط ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے روائتی میلوں ٹھیلوں اور مذہبی تہواروں کے موقع پر کھیلے جانے والے ناٹکوں کا نام آتا ہے۔ان کے بعد تھیٹریکل کمپنیوں میں ڈرامے اسٹیج ہونے لگے اور پھر فلموں کا دور آیا تو فلمی ڈرامے لکھے گئے۔پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رواج سے بھی ڈراموں کی ایک نئی صورت وجود میں آئی ہے۔فلم اور ٹیلی ویژن میں جہاں ڈرامہ بیک وقت آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا جاتا ہے۔وہاں ریڈیو پر ڈرامے کو صرف سنا ہی جا سکتا ہے۔گویا یہ صرف آواز کا کھیل ہے۔بقول بادشاہ حسین

''ریڈیو ڈرامے کی مثال ایسی ہے جیسے گھپ اندھیرے میں کچھ آوازیں آ رہی ہوں۔حالِ دل کہا جا رہا ہے۔جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔احساسات کا اظہار ہو رہا ہے یا زندگی کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں۔سننے والوں کو نہ ان کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں، نہ ان کے افعال نظر آتے ہیں اور نہ ان کی حرکات ظاہر ہوتی ہیں، نہ فاصلوں کا احساس ہے اور نہ اجنبیت کا تاثر، سننے والا گوش برآواز ہے اور ان کی آوازوں ہی سے واقعات اور حالات کا سیاق وسباق، تعلق وربط، رشتہ وتسلسل سمجھ لیتا ہے، چونکہ وہ صرف حسن سماعت ہی سے یہ سب کچھ حاصل کرتا ہے۔اس لئے گہری توجہ اور مکمل دلچسپی لیتا ہے۔

مظہر عباس انصاری ایک عرصے سے ریڈیو سے منسلک ہیں۔اس لئے نثری تمثیل کے تمام اسرار ورموز سے بخوبی واقف ہیں ان کے لکھے ہوئے کئی ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو کر مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ایسے ہی چار ڈرامے پیش نظر کتاب میں شامل ہیں۔

پہلی تمثیل ''گوشہ عافیت'' ٹالسٹائی کی ایک شہرہ آفاق اور مقبول کہانی سے ماخوذ ہے۔دوسری

تمثیل ''سینی ٹوریم'' طبعزاد ہے یہ ایک شکستہ دل کی داستان ہے۔تیسری تمثیل ''نغمہ سنگ'' کا مرکزی خیال جان اسٹین بک کے ناول ''دی پرل'' سے ماخوذ ہے۔ناول کے طویل وعریض پلاٹ میں سے تمثیلی عنصر کا انتخاب مصنف کی فنی مہارت اور ذوقِ تلاش کا ثبوت ہے۔چوتھی تمثیل ''صورت گر'' ہے جس پر اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔اس کھیل کا پلاٹ جان نیرو کے مشہور افسانے ''عزرائیل'' سے لیا گیا ہے مصنف نے افسانے کو بڑی خوبصورتی سے ڈرامے کا روپ بخشا ہے۔

جن تمثیلوں کے مرکزی خیال مغربی مصنفین کی کہانیوں پر مبنی ہیں۔انہیں مصنف نے مشرقی ماحول اور کرداروں میں ڈھال کر ایسی مانوس فضا پیدا کی ہے جس میں کسی قسم کی اجنبیت نہیں۔کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ڈرامے مغربی کہانیوں سے ماخوذ ہیں اور یہی تمثیل نگار کی کامیابی کی دلیل ہے ''سینی ٹوریم'' جو مصنف کی طبع زاد تمثیل ہے۔اسے پڑھ کر مصنف کی مشاقی اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ان سب تمثیلوں کی زبان سادہ، سلیس اور رواں دواں ہے۔کہیں بھی نامانوس اور بوجھل الفاظ وتراکیب کا استعمال نہیں۔ہر جگہ لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔اس کے علاوہ نثری تمثیل نگار کو جو ہر عمر اور ہر طبقے کے سامعین کی پسند وناپسند اور ان کی ذہنی ضروریات کا خیال ہوتا ہے، مصنف نے ان کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور یوں یہ تمثیلیں ہر طبقہ خیال اور ہر عمر کے سامعین کے لئے جاذبِ توجہ ہو گئی ہیں۔

کتاب کا پیش لفظ بادشاہ حسین نے لکھا ہے جس میں انہوں نے ریڈیائی ڈرامے کے فن کے بارے میں قارئین کو بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔اس کے علاوہ آفاق صدیقی نے ''دیدو شنید'' کے عنوان سے کتاب کے مصنف کا تعارف اور زیر تبصرہ تمثیلوں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے۔مجموعی طور پر ''صورت گر'' ایک معیاری پیش کش ہے اور اس وقت جبکہ ریڈیائی ڈرامہ ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔امید ہے ڈراموں کا یہ مجموعہ قارئین میں قبول عام کی سند حاصل کرے گا۔

حدیثِ خواب

''حدیثِ خواب''عبدالعزیز خالد صاحب کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے۔جس میں اُنتیس طویل ومختصر نظمیں اور چھتیس غزلیں شامل ہیں۔طویل نظموں میں ''حکایت نے''تسخیرِ قمر''ابوالحسن کا خواب''ہم''نامۂ نقش گر''اِک پیکرِ تصویر کے نام''اور''اے مرے خوابو سنو!''خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کہ یہ اُن کے خاص ڈکشن میں لکھی گئی ہیں۔کتاب کا آغاز''حکایت نے سے ہوتا ہے یہ طویل نظم ایک سو باسٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بلا مبالغہ سینکڑوں ایسی تلمیحات نظم کی گئی ہیں جن کا تعلق دنیا کے بیشتر خطوں کے زبان وادب سے ہے۔اُردو کی طویل نظموں میں یہ نظم اس لیے بھی نمایاں اور ممتاز ہے کہ ایک ہی موضوع یعنی محبّ اور محبوب کی باہمی نسبت کو بیسیوں اشعار کی صورت میں تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے،لیکن کہیں بھی دلچسپی کی کمی یا یکسانیت محسوس نہیں ہوتی۔پوری نظم میں ایک تازگی ہے جو آخر تک برقرار رہتی ہے۔چند اشعار دیکھیے:

ترے دیار کی خوشبو سے اے چمن آرا
مشامِ جاں کو معطر کرے نسیمِ صبا

.....

میں سوہنی تو مہینوال اے مرے دلدار!
میں صاحباں ہوں تو مرزا میں ہیر تو رانجھا

.....

تو بے نظیر ہے میرا میں تیری بدر منیر
میں ہوں بکاولی تاج الملوک نام تیرا

.....

تو مانگ چاؤ شہنشاہ چین میں لی جائے
میں جو زمیق تیری تو پنولین میرا

ایک اور نظم ہے''ہم''معاشرے میں اہلِ قلم کے مقام ومنصب کو متعین کرتے ہوئے اس نظم میں خالد کہتے ہیں:

ہم البیرونی عصرِ رواں ہیں
رہینِ خانہ و بے خانماں ہیں
نہیں عرضِ ہنر کا ہم کو سودا
فقط سوزِ دروں سے نغمہ خواں ہیں
اگرچہ رہنے والے ہیں زمیں کے
مگر دانائے رازِ آسماں ہیں
اجل سے رات دن دست و گریباں
نظر گاہِ حیاتِ جاوداں ہیں

''اے مرے خوابو سنو!''خوبصورت نظم ہے اس نظم میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خالد کی عام نظموں کے مقابلے میں ترنم اور نغمگی زیادہ ہے۔نظم کا آخری بند ملاحظہ فرمائیے۔

اے شبِ رفتہ کی تانو!اے گئے دن کی دُھنو!
موجِ غم کا کوئی تھل بیڑا کوئی ساحل نہیں
یوں نہ میرے ذہن میں افسوس کے جالے بُنو
یوں نہ میرے دل میں تنہائی کی دیواریں چنو
اے مرے خوابو سنو!

اس مجموعے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طویل نظموں کے دوش بدوش خالد کی متعدد مختصر نظمیں موجود ہیں،ان نظموں کا ایجاز ہی خالد کے کمالِ فن کا اعجاز ہے،مثال کے طور پر تحفہ کے عنوان سے ایک نظم دیکھئے:

میں خوشی کی طرح تہِ دل سے
رنج و غم کو قبول کرتا ہوں

دوست کا یہ گراں بہا تحفہ
مسکرا کر وصول کرتا ہوں

خالد کی شاعری وسیع مطالعے اور گہرے تفکر کی شاعری ہے اُردو نظم میں جس عالی اُسلوب کی بنیاد سودا، ذوق اور انیس نے رکھی تھی اور اقبال اور جوش نے اسے ایک نئی توانائی بخشی تھی۔ اُسی عہد آفریں اُسلوب کو خالد نے اپنی طویل نظموں میں آگے بڑھایا ہے اور یوں انہوں نے بلا مبالغہ ہمارے عصری ادب کو ایک نیا شعری لہجہ عطا فرمایا ہے اسی پرشکوہ لہجے کی بنا پر انہیں عام طور طبعاً نظم کا شاعر کہا جاتا ہے، لیکن ایسا کہنا اُن کے پورے سرمایہ شعر و فن سے پوری طرح آشنا نہ ہونے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں وہ صنف نظم پر فریضہ ہیں وہاں غزل کے تیز نگاہ کے بھی گھائل ہیں۔ اس لیے کہ اُنہوں نے ہمارے دوسرے نظم گو شعرا کے مقابلے میں صنف غزل کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی اُن کی نظموں سے غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ الگ بات ہے اُن کی غزل پر بھی اُن کی نظم کا گہرا اثر ہے کہ اس میں بھی اُن کی نظم کی سی بلند آہنگی تسلسل تفکر اور ترفع ہے۔ یوں اُن کی غزل بھی ہمارے ہاں ایک نیا تجربہ ہے۔ اس کے موضوعات کائنات کی طرح وسیع اور زندگی کی طرح لامحدود ہیں۔ پھر فنی نقطہ نظر سے بھی وہ دوسرے غزل نگاروں کے مقابلے میں اپنی ایک خصوصیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اکثر بحروں کے انتخاب میں اُن کی طبیعت منفرد ہے۔ اسی طرح اُن کے ہاں بیشتر غیر مردف غزلیں ملتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ ردیف کی بہ نسبت قافیے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کی غزل کے بارے میں مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک تازہ، پُرشکوہ اور توانا اُسلوب کی حامل ہے اور اس میں روحِ عصر کا مکمل ادراک اور اظہار ہے، ایک جگہ کہتے ہیں۔

الفاظ مختصر ہوں معانی ہوں تہ بہ تہ
تخلیقِ فن میں حُسن بھی ہو روحِ عصر بھی

یہ غزل اس مجموعے کی بہترین اور نمائندہ غزل کہی جا سکتی ہے:

الفاظ پُر آواز مگر قحطِ نوا ہے
یہ ساعت نا محکمی حرفِ وفا ہے

کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
وہ شورِ قیامت ہے کہ شل دست دعا ہے
اے شیشہ گرو ہے کوئی پیوند کی صورت؟
ٹوٹا ہے وہ آئینہ کہ جو قبلہ نما ہے
احساس پہ موقوف ہے شیرینی و تلخی
نغمہ طرب آور مے اندوہ رُبا ہے
ہے فہم سے مافوق پر اسراری تخلیق
صَرصَر اگر آہنگ میں ڈھل جائے صبا ہے

ان غزلوں کے اشعار کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں اُنہوں نے واقعی الفاظ کے صَرصَر کو اپنی غزل کے آہنگ میں ڈھال کر صبا کی سی لطافت و تازگی عطا کی ہے۔

"حدیث خواب" خالد کے دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں زیادہ مترنم اور منتخب ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مجموعہ جہاں خالد کے شعری کمالات میں ایک وقیع اضافہ ثابت ہوگا، وہاں اُردو شاعری میں بھی ایک خوبصورت مجموعے کے طور پر قبولیت کی سند حاصل کرے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

لبِ گفتار

''لب گفتار'' اختر انصاری اکبرآبادی کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔جس میں ان کی ۲۳ غزلیں ۲۸ رباعیاں اور چند منتخب اشعار شامل ہیں۔اختر صاحب اردو کے جانے پہچانے اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔چنانچہ اس مجموعے کے علاوہ کوئی درجن سے زیادہ شعری ادبی کتابوں کے مصنف ومرتب بھی ہیں مگر ان کا یہ مجموعہ کئی لحاظ سے ان کی دوسری کتابوں سے ممتاز ومنفرد نظر آتا ہے۔اول یہ کہ اس میں ان کی تازہ ترین تخلیقات شامل ہیں۔دوسرے یہ کہ عام روایت سے گریز کرتے ہوئے انہوں نے کسی رسمی دیباچے یا پیش لفظ کا سہارا نہیں لیا اور قارئین تک براہ راست اپنی بات پہچانے کی سعی کی ہے۔

اختر انصاری اکبرآبادی اُردو غزل کے اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔جن کے ہاں روایت کا حسن اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔لیکن اس کے باوجود ہم انہیں روایت پرست شاعر بھی نہیں کہہ سکتے۔اس لئے کہ ان کے ہاں حسنِ روایت کے ساتھ ساتھ جدت فکر کا امتزاج بھی ملتا ہے۔وہ افراط وتفریط کے فراز ونشیب سے بچتے ہوئے راہ اعتدال پر سلامت روی سے گامزن ہیں۔قدرت بیان اور پختگی فن کے علاوہ دورِ حاضر کے سماجی معاشی اور سیاسی حالات کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔چنانچہ ان کی غزل میں خالص عشقیہ مضامین کے ساتھ ساتھ اس شعور کا بھی نمایاں عکس دکھائی دیتا ہے۔مثلاً تسخیر کائنات کے حوالے سے عظمتِ آدم ان کا محبوب موضوع ہے۔فرماتے ہیں۔

ہر ذرہ جو پستی کا ہوتا رہا تابندہ
یہ چاند ستارے سب ہوجائیں گے شرمندہ

کس بلندی پہ رواں تم ہو زمین کے ذروا!
ہیں ستارے نگران اور ذرا تیز قدم

اسی طرح زمینی رشتوں سے اپنے گہرے تعلق کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

اگر زمین کے ذرے پکارتے نہ ہمیں
تو آسماں کے ستاروں سے گفتگو کرتے

ان کی غزلوں کا لہجہ کلاسیکی اور موضوع زندگی کی رنگا رنگ حقیقتوں کا ادراک واظہار ہے یہ اشعار دیکھئے۔

پھر ایک جانب ہیں تند موجیں کہیں سفینے بھٹک نہ جائیں
جو تیرگی میں چراغ ساحل نظر نہ آیا تو کیا کرو گے

غزل کی ریزہ خیالی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں

گلدستہ معنی تو نہیں ہے غزل اختر
افکارِ پریشان کا یہ شیرازہ ہے شاید

لیکن یہ بات عجیب ہے کہ ان کی غزل افکار پریشان کی شیرازہ بندی ہوتے ہوئے بھی گلدستہ معنی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس لئے کہ ان کے ہاں تقریباً ہر غزل میں داخلی طور پر معنوی ربط وتسلسل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

ایک اور بات جو اس مجموعے کی غزلوں میں ملتی ہے۔وہ شاعر کی مختلف النوع بحروں میں طبع آزمائی ہے۔انہوں نے عام شعرا کے برعکس چند مستعمل بحروں کی جگہ زیادہ سے زیادہ مختلف بحروں کو استعمال کیا ہے۔مگر ان میں بھی ترنم اور شگفتگی کو ملحوظ رکھا ہے۔

رباعی ہمارے ہاں صنف سخن کے طور پر اس دور میں اتنی مروج ومقبول نہیں رہی۔لیکن اس کے باوجود دورِ جدید کے کچھ شعراء نے اس صنف کے احیاء کی طرف بھی سنجیدگی سے توجہ دی ہے اور اختر انصاری اکبرآبادی بھی ان میں شامل ہیں۔عام طور پر رباعی اخلاقی حکیمانہ صوفیانہ مضامین تک

محدود رہی ہے اور بالخصوص جب بے ثباتی دنیا اس کا موضوع ہو تو اس کا لہجہ انتہائی حزینہ اور ریاس زدہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کی غزل کی طرح رباعی میں بھی ان کا لہجہ نشاطیہ ہے وہ امید پرست اور رجائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیات عزم و عمل کی علامت ہیں۔ زندگی کے بارے میں یہ مثبت اندازِ فکر یقیناً صحت مندانہ اور تعمیری ہے۔ مثلاً ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

ہو پھول تو تازگی کو ثابت بھی کرو
ہو شمع تو روشنی کو ثابت بھی کرو
ہے نام تو پھر گوشہ گمنامی کیسا
زندہ ہو تو زندگی کو ثابت بھی کرو

غرض "لب گفتار" ہمارے شعری مجموعوں میں ایک ایسا خوشگوار اضافہ ہے۔ جسے نئے اور پرانے دونوں ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اردو کے خوابیدہ الفاظ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں اردو کے ایسے الفاظ کا ذکر ہے جنہیں ہم بول چال اور لکھنے پڑھنے میں آجکل بہت کم استعمال کرتے ہیں۔

لیکن ہماری علاقائی زبانوں میں یہ کسی نہ کسی طرح زندہ ہیں۔ بقول اشفاق احمد یہ الفاظ خوابیدہ ضرور ہیں۔ مگر متروک نہیں کیونکہ ایک تو علاقائی زبانوں میں ان کے روزمرہ استعمال نے انہیں زندہ رکھا ہے۔ دوسرے اردو کے مستعمل محاوروں اور ضرب الامثال میں گاہے گاہے ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زبان اپنی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے ایک وسیع اور ہمہ گیر زبان ہے اور اس میں اظہار و بیان اور معانی و مطالب کے نازک اور لطیف پہلوؤں کیلئے ہر طرح کا لفظ موجود ہے۔ اس مختصر سی کتاب کا مقصد قارئین کو چند ایسے الفاظ سے روشناس کرانا ہے۔

اس کتاب میں شامل الفاظ کو جن تین معروف لغتوں میں سے منتخب کیا گیا ہے۔ ان کے نام ہیں فرہنگ آصفیہ مولفہ مولوی سید احمد دہلوی مطبوعہ دلی .....نور اللغات مؤلفہ نور الحسن نیر مطبوعہ لکھنؤ اور Adictionary of Urdu , classical Hindi and English مطبوعہ لندن۔

اگر چہ اس کتاب کے الفاظ کی فہرست میں اضافے کی بھی گنجائش تھی تاہم اس مختصر سی لغت میں خوابیدہ الفاظ کا جو بیش قیمت ذخیرہ دے دیا گیا ہے۔ وہ لائق تحسین ہے اس ذخیرے کے بیشتر الفاظ ہماری خاص توجہ چاہتے ہیں مثال کے طور پر آلا، بالن، باوا، بڑک لکل، تمبو، ٹیوا، خیر سلا، رساول، سالو، سُرت، سوتک، گنگ، ماڑا مخول، ملوک، میل خورا ور مینڈی ایسے الفاظ ہیں جنہیں ہماری تحریر و تقریر میں ان کا کھویا ہوا مقام ملنا چاہیے۔

لغاتِ سرائیکی

سرائیکی زبان خطہ پنجاب میں پنجابی کے بعد دوسری بڑی زبان ہے۔اس کو بولنے والے ملتان ڈیرہ غازیخان اور بہاول پور ڈویژن سے تعلق رکھتے ہیں۔ملتان کی زبان کو ملتانی اور بہاولپور کی زبان کو بہاولپوری کہتے ہیں لیکن ہر دو مقامات کی بولی،اس کا لب ولہجہ اور ادب کا سرمایہ یقیناً ایک ہے اور علاقائی تفاوت ختم کر کے اسے ایک نیا نام دیا گیا ہے۔سرائیکی جو معنوی لحاظ سے ملتانی یا بہاولپور سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور لسانی وحدت کا ترجمان ہونے کی وجہ سے اہم ہے۔

زیرِ نظر کتاب سرائیکی زبان کی لغات ہے ایک عرصے سے سرائیکی اُردو لغات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن کوئی ماہر لسانیات اس طرف توجہ نہ دے سکا محمد بشیر احمد ظامی بہاولپوری صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سرائیکی کی پہلی لغات مرتب کر کے ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصے میں سرائیکی کے الفاظ اور اردو میں ان کے معنی درج ہیں اور یہ حصہ نصف سے زیادہ کتاب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ سرائیکی محاورات،ضرب الامثال پہیلیاں اور خوانچہ والوں کی آوازوں پر مشتمل ہے۔جو بہت دلچسپ ہے تیسرے حصے میں سرائیکی بولنے والے علاقے کی رسوم و روایات تہذیب وتمدن لوک گیت،لوک ناچ اور لوک کہانیوں کے بنیادی تذکرے شامل ہیں جن سے اس علاقے کے لوگوں کی ثقافت ومعاشرت کے بارے میں کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔چنانچہ اس تیسرے حصے کے اضافے سے کتاب کی افادیت اور جامعیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے کتاب کے آغاز میں سرائیکی حروف تہجی اور آخر میں گنتی بھی شامل ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک لغات ہے لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سرائیکی زبان وادب کی

ایک اہم دستاویز ہے کسی زبان کی لغات مرتب کرنا فرد واحد کا کام نہیں۔اس کے لئے ایک مستقل ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ظامی صاحب کی یہ کوشش ان کی انفرادی کوشش ہے۔اس کے ساتھ ساتھ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ لغات اپنی نوع کی پہلی کاوش ہے۔اس لئے بعض مقامات پر مطالب ومعانی میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے یا ممکن ہے ترتیب میں کئی اہم امور رہ گئے ہوں۔اسی طرح بہاولپوری اور ملتانی رسم الخط میں بھی اختلاف ہے۔اس کتاب میں بہاولپوری رسم الخط کا استعمال کیا گیا ہے جو ملتان والوں کے لئے محل نظر ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ سرائیکی کے نام کی طرح اس کے رسم الخط میں بھی یکسانیت پیدا کی جائے۔

بہرحال یہ کتاب اپنی نوع کی پہلی کامیاب کوشش ہے اور اس سلسلے میں ظامی صاحب کی محنت وکاوش قابل داد ہے۔ہماری رائے میں ایسی مفید کتاب کا ہر قومی ونجی دارالمطالعے میں ہونا ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆☆

رفتگانِ ملتان

ملتان مدینۃ الاولیاء ہی نہیں، شہرِ ادب وفن بھی ہے کہ یہ معمورہ ہر دور میں مختلف باکمال شخصیات سے آباد رہا ہے۔ ادیب، شاعر، صحافی، استاد اور دانشور ہر شعبے سے متعلق افراد کی ایک کہکشاں ہے جو ہر عہد میں جگمگاتی رہی ہے۔ اس کہکشاں کے ستارے اگرچہ ایک ایک کر کے ڈوبتے چلے گئے لیکن ان کی روشنی آسمان ادب پر کسی نہ کسی طرح آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ آج بھی صابر دہلوی، پرواز جالندھری، قمر لکھنوی اور ہلال جعفری کا دل گداز ترنم اس شہر کی فضاؤں پر چھایا ہوا ہے۔ آج بھی کشفی ملتانی، آغا خاموش، گلچیں کرنالی، صادق مصور، تاثیر نقوی اور صوفی رامپوری کا دل نشیں تحت اللفظ چار سو گونجتا ہے۔ آج بھی افق کاظمی، عزیز حاصل پوری، ادب سیمابی، مذاق العیشی اور خادم کیتھلی کی عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی پرسوز آوازیں ہواؤں میں رہ رہ کے ابھرتی ہیں۔ لیکن بکھری ہوئی آوازیں اس خطے کی فضا کا مستقل حصہ تبھی بن سکتی ہیں۔ جب ہم ان کی یاد کو بار بار دہراتے رہیں۔ ماضی بعید کی تو بات ہی کیا؟ ہم ماضی قریب کے لوگوں کو بھی رفتہ رفتہ بھولتے جا رہے ہیں۔ مثلاً نور احمد خان فریدی، خلیق ملتانی، قیصر ہوشیار پوری، شمیم شمسی، انور مرزا، سجاد بریلوی، عبدالغنی فوق، کیفی جامپوری، پروانہ بجنوری، طاہر کپورتھلوی، ریاض انور، منیر فاطمی، صوفی آذر، مقبول تنویر، وحشت ملتانی، رشید روہتکی، چاچا جگ، ذوالفقار راغب، سجاد یزدانی، رنگین فیروز آبادی، میکش لکھنوی، جمیل صدیقی، تصدق رسول، شوکت رسول پوری، احسن نسیم، ابوالحسن قاسمی، شیخ اکرام الحق اور منشی عبدالرحمٰن۔

زندہ قومیں وہ ہیں جو اپنے زندوں کو یاد رکھتی ہیں ہم تو اپنے مردوں کو بھی یاد نہیں رکھتے۔ ہم میں سے کتنے ہوں گے جو آج ظہیر شہرتی، راقی براہیمی، ابراہیم شارب، منظر قریشی، اسلم شیخ، الیاس جوہر، عبدالسلام حیدر، عبدالستار دل، سجاد کلیم، قیصر درانی، سروش درانی، مسلم دہلوی، اسرار

تابش، عبدالرحیم ثانی، گلزار تبسم، کمال احمد ضیا اور نثار خاور کے نام سے بھی آشنا ہوں۔

رضی الدین رضی لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے رفتگانِ ملتان میں سے کم و بیش تیس شخصیات کی یادوں کو اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً حیدر گردیزی، خان رضوانی، محسن گردیزی، منیر فاطمی، طفیل ابن گل، حزیں صدیقی، تابش صمدانی، حق نواز خرم، زوار حسین، بیدل حیدری، قمر الحق قمر، ابن حنیف، عرش صدیقی، ضیغم شیروی، نثار احمد اختر، شعیب الرحمٰن، مقصود زاہدی، ارشد ملتانی، عارف محمود قریشی، قاسم عدیل، اسلم یوسفی، ولی محمد واجد، عمر کمال خاں، ممتاز حیدر ڈاہر، جعفر شیرازی اور ممتاز العیشی وغیرہ۔

بقول رضی یہ مضامین اس نے خود نہیں لکھے بلکہ موت نے اس سے لکھوائے ہیں۔ وہ لکھتا ہے ..... ”یہ رفتگانِ ملتان کے نوحے ہیں، یہ میری اپنی موت کی کہانی ہے۔ لحظہ لحظہ موت کی کہانی ..... اور حقیقت بھی یہ ہے کہ موت ایک دم نہیں آتی۔ یہ رفتہ رفتہ مکمل ہوتی ہے۔ ہم آہستہ آہستہ مرتے ہیں۔ کسی پیارے کسی دوست کی بزرگ یا کسی استاد کی موت ہمیں لحہ لحہ زندگی سے دور کرتی جاتی ہے۔ ہر موت کے نتیجے میں ہمارے کچھ معمولات ہم سے چھن جاتے ہیں۔ ہماری محفلوں کی رونق کم ہوتی ہے۔ ہم کچھ منظروں کچھ چہروں اور کچھ آوازوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہر دوست بچھڑتے وقت ہمارے دامن میں اپنے حصے کی ایک تنہائی ڈال جاتا ہے۔ وہ وقت جو ہم اس دوست کے ساتھ گزارتے تھے۔ وہ ہم کسی اور کے ساتھ نہیں گزار سکتے۔ ہم ہر دوست کی موت پر ایک نئی تنہائی کا شکار ہوتے ہیں اور یہ بہت سی تنہائیاں مل کر رفتہ رفتہ ہمیں بالکل تنہا کر دیتی ہیں۔ پھر ہمیں قبر کی تنہائی نصیب ہوتی ہے اور یوں موت کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔“

موت کے بارے میں رضی کا یہ فلسفہ کتنا گہرا اور کتنا سچا ہے ..... حقیقت یہ ہے کہ موت سے بڑی حقیقت کوئی نہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ رضی کو زندگی سے زیادہ موت میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ موت کی طرف بے ساختہ متوجہ ہوتا ہے جیسے وہ اس کی محبوبہ ہو۔ موت سے اس کا سب سے پہلا تعارف صرف ساڑھے تین سال کی عمر میں اس جنازے کی صورت میں ہوتا ہے جو اس کے والد کا جنازہ تھا اور پھر جنازوں کے تسلسل نے اسے موت سے اس قدر مانوس کر دیا کہ اُس نے گزرے ہوئے اپنے دوستوں اور بزرگوں کے نوحے لکھنا شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ یہ ماتمی تحریریں یہ تعزیتی کالم، یہ نوحے، مضامین کے ایک قبرستان کی شکل اختیار کر گئے

اور رفتگانِ ملتان وجود میں آ گئی۔

عام طور پر لوگ مرنے والوں کی یاد میں مرثیے لکھتے ہیں لیکن رضی نے ان کی یاد میں نوحے کہے ہیں اور وہ بھی نثر میں۔ مرثیے اور نوحے میں یہ فرق ہے کہ مرثیہ لکھنے والا صرف اوروں کو رلاتا ہے۔ جبکہ نوحہ کہنے والا خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے..... یوں ایک طرح سے نوحہ کہنے والا موت کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے اور رضی نے یہ مکالمہ کچھ اس ڈھب سے کیا ہے کہ اس کی ذات بھی خود اس کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

ان نوحوں کو لکھ کر رضی خود تو رویا ہی ہوگا میں نے بھی اس کے حرف حرف پر آنسو بہائے ہیں۔ کہ یہ میرے بھی پیاروں کے جاں گداز تذکرے ہیں۔ اپنے عہد کے رفتگاں کی یادوں کو تازہ کر کے رضی نے جیسے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ ایک قرض اور ایک فرض جو اہلِ ملتان پر واجب تھا۔ اسے پورا کیا ہے۔ مگر اس سے بھی بڑا قرض ابھی باقی ہے۔ ماضی قریب کے رفتگاں کی یادوں کو تازہ کرنے کا فرض۔ کہ اسے رضی سے سینئر لوگوں کو ادا کرنا ہے۔ کاش کوئی اور رضی الدین رضی یہ قرض اور فرض پورا کر دے۔

رضی کو قسامِ ازل نے شاعر کا دل ادیب کی زبان اور صحافی کی نظر عطا کی ہے۔ اس نے ان صفات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ ان تحریروں میں کہیں شاعری کا سا لطف ملتا ہے۔ کہیں کہانی کی سی دلچسپی اور کہیں خاکے کی سی مرقع نگاری۔ اس کا اسلوب اس قدر دل نشیں ہے کہ پڑھتے ہوئے آپ اس کتاب کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔ اسے ایک ہی نشست میں پورا پڑھیں گے۔

یہ کتاب دبستانِ ملتان کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور اسے لکھ کر رضی نے ملتان کے ایک عہد اور ایک دور کی شخصیات کے نام اور کام کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر کے ایک قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں شخصیات مقامات اور اخبارات کا ایک اشاریہ بھی شامل ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ضبطِ گریہ

ڈاکٹر خان محمد ساجد بنیادی طور پر ایک سائنسدان ہیں کہ ان کی فکر معروضی ہے۔ اور وہ زندگی کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن قدرت نے ان کے سینے کو درد سے معمور ایک دھڑکتا ہوا دل بھی عطا کیا ہے۔ جو ذرا سی چوٹ پر تڑپ اٹھتا ہے۔ یہیں ان کی شاعری جنم لیتی ہے۔ گویا وہ بیک وقت سائنسدان بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ایسا سائنسدان اپنے تجربات میں احساسات کے حُسن کا حامل ہوتا ہے۔ اور ایسا شاعر اپنی فکر میں حقیقت پسندی کی نگاہ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور اسی سے اس کی شخصیت میں توازن اور اعتدال کا حُسن پیدا ہوتا ہے۔ یوں وہ ایک کامیاب انسان ہیں کہ انہیں خدا نے قلب ونظر دونوں کی وسعتیں اور رفعتیں عطا کی ہیں۔

اُن کا پہلا مجموعہ کلام "کربِ امید" کے نام سے منظرِ عام پر آیا تھا۔ جس میں زندگی کے کبھی نہ ختم ہونے والے کرب کا اظہار ہے۔ دوسرا مجموعہ "ضبطِ گریہ" ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کرب و رنج کا فطری نتیجہ گریہ وبکا ہے۔ کہ بقول غالب

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

لیکن جب اس گریہ وبکا کی کیفیت کو ضبط کرنے کی سعی کی جائے تو دل پھر اک کرب اور دکھ سے آشنا ہوتا ہے۔ اور کچھ یہی صورت حال ساجد صاحب کے اس دوسرے مجموعہ کلام میں ہمیں نظر آتی ہے۔ عہدِ موجود کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ کچھ اتنا تلخ اور خوفناک ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھ میں اس کی کرچیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ قدم قدم پر رنگ ونسب کے نام پہ نفرت کے الاؤ جل رہے ہیں، دہشتوں کا بازار گرم ہے اور وحشتوں کا چلن عام ہے۔ ایک حساس دل اس انسان دشمن فضا میں کس طرح خاموش رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر خان محمد ساجد بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

اب میڈیا کی قید میں قوموں کی آن ہے
انسانیت کے نام پہ نفرت جوان ہے
اے منصفو اے رہبرو تم ہی کہو
کس مصلحت کی راہ پہ ایمان ہے

رنگ و نسب کی دیویوں کا دان ہے
کن وحشتوں کی راہ پر انسان ہے

لمحۂ حاضر کے افق پر روشنی کی جگہ تیرگی اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ کہیں رہبری کو ایک ستارہ بھی نظر نہیں آتا۔

بھٹکے ہوؤں کو کون دکھائے گا راستہ
اب آسماں سے سارے ستارے چلے گئے

معاشرے میں طبقاتی فرق اور تضادِ عہدِ رواں کا المیہ ہے جو ہر حساس دل کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔

تو نے دُنیا میری اجاڑی ہے
اے غریبی کہیں بسا مجھ کو

تھی شفا ہاتھ میں کبھی جس کے
خود ہے محتاج اب دواؤں کا

ساجد غزل کے شاعر ہیں اس لئے غزل کے پیرائے میں ہی وہ سماجی اور سیاسی حقائق کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

میں انساں ہوں ساجدؔ فرشتہ نہیں ہوں
بگڑتا رہا ہوں سنورتا رہا ہوں

ہوں اچھے دن تو ہر اک غیر اپنا بن ہی جاتا ہے
پڑے جو وقت تو بنتے ہیں اپنے بھی تماشائی

اتنی خبر تو ہے کہ بہت تیز گام ہوں
لیکن خبر نہیں ہے کہاں جا رہا ہوں میں

ملتی نہیں ہیں کلیاں کانٹوں کے بیج بو کر
تو بھی نہ خوش رہے گا یہ تیر یوں چبھو کر

اس بحرِ بے اماں میں تو بھی رہے گا بے کل
تو بھی نہ خوش رہے گا کشتی میری ڈبو کر

زندگی کے بارے میں کلی کا استعارہ اگرچہ پرانا ہے۔لیکن ساجدؔ نے ندرتِ بیان سے اس میں تازگی کی کیفیت پیدا کردی ہے۔

حیاتِ مضطرب میں بارہا ایسے مقام آئے
کلی دل کی کھلی کھل کے ہنسی ہنس ہنس کے مرجھائی

ایک جگہ شدتِ احساس کو کس خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔

سارے جہاں کے ظلم پہ ہم خندہ لب ہوئے
مارا جو تُو نے پھول تو آنسو نکل پڑے

میرے خیال میں یہ ایک شعر ہی ساجدؔ کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔اسی طرح یہ شعر ان کے منشورِ حیات کا ترجمان نظر آتا ہے۔

یہ تیرگی جو دلوں میں ہے یوں نہ جائے گی
لہو کے دیپ جلاؤ تو کوئی بات بنے

ساجدؔ کی شاعری میں جہاں تنقیدِ حیات اور تلقینِ انقلاب ہے وہاں خالص تغزل کے اشعار کی بھی کمی نہیں۔درج ذیل اشعار میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں۔

تڑپنا، کسمسانا اور یوں گھٹ گھٹ کے مرجانا
محبت نام ہے جس کا وہ شائد اس کو کہتے ہیں

میں چل رہا ہوں مہرباں کانٹوں کا دامن تھام کر
غم کے سفر میں جان لے تنہا نہیں ہوں میں ابھی

عشق کی آگ ہے نہ چھیڑ اس کو
اور جلتی ہے یہ بجھانے سے

حسرتو! ڈھونڈتی ہو کس گھر کو
آؤ تم آج میرے گھر آؤ

چند روزہ حیات ہے مل لو
کیا بھروسہ ہے دھوپ چھاؤں کا

اس رہ گذر پہ ڈھونڈتے ہو تم سکون دل
جس رہ گذر پہ کوئی بھی شاداں نہ مل سکا

جان دی جس پہ میں نے اے ساجدؔ
آج کہتا ہے بے وفا ہوں میں

دشمنوں میں جو ہے سر فہرست
میں اسی آدمی پہ مرتا ہوں

روٹھ چکی ہیں رات کی نیندیں اجڑی آنکھوں سے
ساجدؔ کوئی لوٹ چکا ہے میرے دل کا چین

کہکشاں کے درمیاں

اقبال ارشد کی شعری کائنات میں جہاں غزلوں کے سینکڑوں سیارے گردش کر رہے ہیں وہاں اس کی رنگا رنگ نظموں کی ایک کہکشاں بھی آباد ہے جو جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس کی غزل پر بھی اس کی نظم کا زیادہ اثر ہے اور یہ اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے۔

اب تک اس کی غزلوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے نظر انداز.....لیکن اس کی نظموں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ فصیل و پرچم، خماسی اور سرمایۂ حیات، جن میں ''خماسی'' نظم کی دنیا میں اس کا ایک خوبصورت تجربہ ہے اور فصیل و پرچم اور سرمایۂ حیات اس کی دینی اور ملی نظموں پر مشتمل ہیں۔ اس کا تازہ مجموعۂ نظم ''کہکشاں کے درمیاں'' ہے جس میں واقعی نظموں کی ایک کہکشاں ہے جو بحرِ ذخار کی طرح ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ اس میں اس کی ۱۱۷ نظمیں شامل ہیں اور ساری کی ساری اس کے اُسلوبِ خاص کی نمائندہ ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ اقبال ارشد کا یہ اسلوبِ خاص کیا ہے؟ اس کے لیے ہمیں شاعر کے فکری سفر اور شعری ارتقاء پر غور کرنا ہوگا اور اس کے اسلوبِ شعر کے عناصرِ ترکیبی کو دیکھنا ہوگا۔

اقبال ارشد کے ہمدمِ دیرینہ اور اس کے یارِ غار کی حیثیت سے مَیں جانتا ہوں کہ لڑکپن ہی سے اُسے غالب، اقبال، جوش، فیض اور اختر الایمان پسند رہے ہیں۔ غالب سے اُس نے فکر کی گہرائی، تو اقبال سے سخن کی رعنائی کا اکتساب کیا ہے۔ جبکہ جوشؔ سے شوکتِ لفظی اور فیض سے جمالِ اظہار کا اثر لیا ہے۔ اختر الایمان کی معریٰ نظموں کے ڈکشن اور طرزِ بیاں سے بھی وہ متاثر ہے۔ ان سارے باکمال شاعروں کے فکر و فن کو اس نے اپنی ذات میں سمو کر ایک روشن خیالی اور نادر اسلوبی سے مرکب تخلیقی شاعری کو پیش کیا ہے جو اپنے اندر ایک سدا بہار کشش اور جاذبیت رکھتی ہے۔

اس کی نظموں کے عنوان اس کے ہاں جہاں زندگی کی رنگا رنگی کی علامت ہیں وہاں ایک خوابناک

تجرید کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً کالے سمندر میں سفر کی ایک رات، کمپلیکس، ساعتوں کے زخم، آواز کی روح، روح کی آواز، تعبیر ایک خواب کی، فانوسِ دل، سرحدِ حرماں، مرگِ مناظر، خواب کا شعلہ، آخری رات کا سفر، پیاسی روح کا سفر، نیا افق پرانا آدمی، خواب جزیرہ، آوارہ آوازیں، خوشبو کا خوف، تصویریہ، روح کا غم، طلسمِ ہوشربا، سرِ ساحلِ بصارت، خلا ناممکن ہے اور سفر جاری ہے۔ گویا تجرید اور تشکیک کی فضا ان نظموں کے متن پر طاری ہے جو مجموعی طور پر ان کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔

مقفیٰ اور غیر مقفیٰ معریٰ اسلوب کے علاوہ اُس نے کچھ آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن زیادہ تر اس کی نظمیں پابند صورت میں ہی ہیں۔

جہاں تک ان نظموں کے موضوعات کا تعلق ہے فراق، نارسائی، پیاس اور خواب اُس کے سب سے اہم موضوع ہیں۔

فراق محبوب سے جدائی کی صورت میں ہو یا روحِ ازل سے دوری اور اس کی مجبوری کی شکل میں اس کے ہاں چھایا ہوا ہے۔نارسائی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ہر جگہ منزل سے محرومی اور اس کے نتیجے میں نامبوری اس کا مقدر نظر آتی ہے۔اس نارسائی کے نتیجے میں ایک تشنگی اور ادھورے پن کا عالم دکھائی دیتا ہے اور اس ساری کیفیات پر سوتے جاگتے ایک کہر آلود خواب کا سا سماں محسوس ہوتا ہے۔

اس طرح ان نظموں پر حزن اور الم کی ایک نیم تاریک فضا سایہ فگن نظر آتی ہے۔اس کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت اس کے مصرعوں کا بے ساختہ پن ہے جن میں شگفتگی، روانی اور ترنم ہے۔بعض اوقات اس کی نظم پڑھتے ہوئے ہمیں غزل کا سا رچاؤ محسوس ہوتا ہے اور اس کی ایک نظم کا عنوان بھی نظم میں غزل ہے۔

صنف شعر کی حیثیت سے نظم اور غزل کا اپنا اپنا مزاج ہے۔نظم میں تسلسل اور وحدتِ تاثر لازمی ہے جبکہ غزل میں اس کے برعکس ریزہ خیالی اور تاثر کی رنگا رنگی ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر نظم گو عام

طور پر غزل کے میدان کا شہسوار اور ہر غزل گو نظم کی دنیا کا فاتح نہیں ہوتا۔لیکن بعض اوقات اس میں ایک استثناء کی بھی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اقبال ارشد کے خلاق قلم کو یہ استثناء حاصل ہے کہ وہ نظم میں غزل اور غزل میں نظم لکھنے پر قادر ہے۔

مَیں نے پہلے کہا ہے کہ اقبال ارشد بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے لیکن ارضِ غزل بھی اس کی مفتوحہ مملکت میں شامل ہے۔کہکشاں کے درمیاں کی یہ نظمیں قاری کو جہاں ایک خوبصورت اسلوبِ شعری سے آشنا کریں گی وہاں اس کے لیے ایک خوشگوار تحیر کے ساتھ ساتھ تسکینِ روح کا سامان بھی مہیا کریں گے۔

اُردو کے شعری سرمائے میں ان دلکش، دلآویز اور دلفریب نظموں کا میں والہانہ استقبال کرتا ہوں کہ یہ شاعری واقعی ایک گراں بہا اور گراں قدر اثاثہ ہے۔مجھے امید ہے کہ ہمارے آسمانِ شعری پر روشن نظموں کی یہ کہکشاں ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

مرشدِ من

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ ان صوفیائے کرام میں شمار ہوتے ہیں جن کے ارادت مند لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور جنوبی پنجاب کا خطہ خاص طور پر ان کے روحانی فیوض و برکات کا مرکز ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ ایک ولی کامل تھے بلکہ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت عالمگیر ہے۔ ان کی سوز و گداز سے پر کافیاں آج بھی محبت بھرے دلوں کو گرماتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرائیکی یعنی ملتانی زبان کے وہ سب سے بڑے شاعر ہیں۔

گزشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں خواجہ صاحب کی شخصیت اور ان کی شاعری پر متعدد اہل قلم نے طبع آزمائی کی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ حال ہی میں خواجہ صاحب کے ایک ارادت مند جناب محمد سعید احمد شیخ نے اپنے مرشد کی حیات مبارکہ پر چند تحقیقی مضامین کو ''مرشدِ من'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس سے پیشتر جہانِ فریدؒ کے عنوان سے مؤلف نے خواجہ صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر غالباً پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کی فہرست سے بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ تصنیف تحقیقی نقطہ نظر سے کس قدر دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل ہوگی۔ مثلاً شخصیت فرید اپنے عہد کے تناظر میں۔ عشق مصطفیٰ اور خواجہ فرید خواجہ فرید اور کافی، دیوانِ فرید کے اوزان اور قوافی کا مسئلہ۔ خواجہ فرید اور ملتان۔ خواجہ فرید کے ایک سید مرید کا احوال۔ خواجہ صاحب اور میری مریدی۔ خواجہ صاحب کا ساون سے عشق۔ خواجہ صاحب کا اپنے ملازمین کے ساتھ حسن سلوک۔ خواجہ صاحب اور نازک مزاجی۔ خواجہ صاحب اور ملائیت۔ خواجہ صاحب کے روہی میں گزرے ایام کا احوال۔ شخصیت فرید کا سماجی پہلو اور خواجہ صاحب کا سفرِ حج۔ اس کتاب میں مؤلف نے خواجہ صاحب کی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ نہایت سادہ معصوم اور ہر طرح کے تصنع اور ریاکاری سے پاک سچے اور کھرے دل کے انسان کی تصویر ہے۔ ان کی سوچ بے لوث اور ان کا

اٹھنا بیٹھنا اور دیگر معمولات اس قدر سادہ اور عام سے ہیں کہ وہ کہیں سے بھی ایک سکہ بند مفکر یا نہایت قابل استعداد فلسفہ دان یا کسی بڑی گدی کے سجادہ نشین یا کئی نوابوں اور رئیسوں کے پیر دکھائی نہیں دیتے۔

کتاب کی زبان اور اس کا انداز بیان سادہ مگر دلچسپ اور پر اثر ہے۔ بقول ظہور دھریجا اس کتاب کی بدولت فریدیات کے طالب علموں کے سامنے یہ عقدہ کھلنے چلا ہے کہ ایک عظیم آدمی کس کمال طریقے سے دنیاوی ایام حیات بسر کر کے حیات جاوداں کی طرف روانہ ہوا۔ یوں یہ کتاب فریدیات میں ایک وقیع اور گراں بہا اضافہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆

تیری یادوں کے نقوش

فیض احمد فیض، علامہ اقبال کے بعد دورِ حاضر کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی صدی انہی کی صدی ہے۔ اردو شاعری میں ان کا اسلوب اپنے معاصرین میں سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ فیض 1911ء میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے آجکل ان کا صد سالہ جشن ولادت منایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ ''تیری یادوں کے نقوش'' جس میں فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور خاکوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کے مرتب معروف نوجوان اہل قلم شاکر حسین شاکر ہیں۔ جنہوں نے بڑی محنت اور کاوش سے اسے مرتب کیا ہے۔ لکھنے والوں کی فہرست الف بائی ترتیب سے ہے اور اس میں جن معروف و غیر معروف ادیبوں کی ۴۰ تحریریں شامل ہیں۔ ان میں آغا ناصر، ڈاکٹر آفتاب احمد، آئی اے رحمان، ابراہیم جلیس، احمد سلیم، اختر جمال، اشفاق احمد، افتخار عارف، امرتا پریتم، انتظار حسین، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ایوب مرزا، اے حمید، پیر حسام الدین راشدی، جگن ناتھ آزاد، حمید اختر، خلیق انجم، خواجہ احمد عباس، رام لعل، ساقی فاروقی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر سلیم اختر، شاہد احمد دہلوی، صوفی تبسم، ظ انصاری، عشرت رحمانی، علی سردار جعفری، فارغ بخاری، فخر زمان، فقیر وحید الدین، فکر تونسوی، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، کشور ناہید، کنہیا لال کپور، مرزا ظفر الحسن، مستنصر حسین تارڑ، مشتاق یوسفی اور یاسر عرفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کی بیگم ایلس فیض۔ ان کی صاحبزادیوں سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی اور خود فیض صاحب کی اپنی تحریر بھی شامل ہے۔ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فیض کے معاصرین ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کتاب کا انتساب ڈاکٹر صلاح الدین

حیدر کے نام ہے اور اسے بڑی تقطیع کے سات سو سے زائد صفحات پر شائع کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فیض کی دل نشیں شخصیت اور ان کی دل نواز شاعری کو سمجھنے کے لئے کتاب میں شامل اکثر مضامین نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ جو فیض شناسی کے سلسلے میں ہمیشہ معاون ثابت ہوں گے۔ ملک کے معروف ناشر ادارے سنگ میل پبلی کیشنز نے اس ضخیم دستاویز کو شائع کر کے فیض ایسے عظیم اور مقبول شاعر کے حضور ان کے شایانِ شان خراج تحسین پیش کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وارے نیارے

ہمارے یہاں طنز ومزاح کی حقیقت مسلمہ ہے۔ہر دور میں شگفتہ اور لطیف تحریریں اردو کے دامن کو سدا بہار پھولوں کی طرح مہکاتی رہی ہیں۔لمحہ حاضر میں بھی اس کی خوشبو سے ادب معطر ہے۔بزرگ اہل قلم مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین کے دوش بدوش نوجوان لکھنے والے بھی اس میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔انہی نوجوانوں میں مہر ادسحر کا نام بھی آتا ہے۔ مہزاد کی کتاب ''وارے نیارے'' طنز ومزاح پر مشتمل ان کے تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔جس کا پہلا ایڈیشن 1993ء میں منظر عام پر آیا تھا جبکہ دوسرا ایڈیشن 1997ء میں شائع ہوا۔کتاب کے مضامین کے عنوانات سے اس کے موضوعات کی رنگا رنگی کا انداز ہوسکتا ہے۔مثلاً ہیلو ہیلو۔موناپا۔ مس پپی بائی۔آئی لو یو۔اشتہارات۔رونمائی۔کاش ہم لڑکی ہوتے۔گلو۔ہیئر کٹنگ۔تعلیم بال غاں غوں۔فرسٹ ایڈ۔انجن نیرنگ اور وارے نیارے کنوارے۔مصنف چونکہ خود نوجوان ہے اور یہ مضامین اس نے یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران لکھے ہیں۔اس لئے فطری طور پر یونیورسٹی کے خاص ماحول کی ترجمانی اس میں ملتی ہے۔اس کے علاوہ جہاں عام سماجی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔وہاں بھی ایک نوجوان کے نقطہ نظر کا عکس صاف نظر آتا ہے۔یوں پوری کتاب کے مزاج پر ایک تروتازگی کی لہر چھائی ہوئی ہے۔چنانچہ مشکل سے مشکل اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے کے بیان میں بھی ہمیں شگفتگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔کتاب کا انداز بیان سادہ مگر نہایت دلچسپ ہے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے برمحل جملوں کی بدولت مضحک صورتحال دکھائی دیتی ہے تو کہیں بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ بات سے بات پیدا کی گئی ہے اور مہزاد کا یہی اسلوب اسے دوسرے نوجوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔مثال کے طور پر اس کی تحریروں سے چند اقتباسات دیکھئے۔

اخبار دیکھ کر لگتا ہے کہ کرکٹ کے پچاس ہزار تماشائیوں میں صرف لڑکیاں ہی ہیٹ پہنے بھرپور داد دے رہی تھیں۔(کاش ہم لڑکی ہوتے)

آغا کا کہنا ہے کہ وہ پیدائشی شاعر ہیں اور پیدا ہوتے ہی انہوں نے یہ شعر عطا کیا تھا۔

آں آں اوں اوں　　دفع دور فٹے منہ

خیال رہے کہ دوسرا مصرع سامنے کھڑی نرس نے ادا کیا تھا۔(رونمائی)

بیوی کے سامنے آئی لو یو کہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا وصیت کے آخری الفاظ دہرانا (آئی لو یو)

گلو کی آواز اتنی بھاری تھی کہ اگر وزن کراتے ہوئے بول پڑتا تو مشین دگنا وزن بتاتی تھی۔(گلو)

لڑکی چاہے بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔اگر وہ جیل کی دال کی طرح پتلی ہے تو بہرحال لڑکی ہے۔لیکن اگر وہ بہت موٹی ہے تو لڑکی نہیں صرف موٹی ہے۔(موناپا)

نثری نظم کاغذ پر دیکھنے سے شاعری اور زبانی سننے پر جملہ لگتی ہے۔(مس پپی بائی)

بچپن میں آواز ایسی تھی کہ ابا کے دوست فون پر بات بیٹی کہہ کر شروع کرتے اور اب تو اتنی بھاری ہوگئی ہے کہ ریٹائرڈ حضرات بھی فون پر انکل سے بات شروع کرتے ہیں۔(ہیلو ہیلو)

ہم نے یونیورسٹی میں ایسی ایسی لڑکیوں کو بھی گردن اکڑا کر چلتے دیکھا ہے۔جن کی گردن تو صراحی دار نہیں ہوتی۔البتہ سراپا ضرور مٹکانما ہوتا ہے۔(انجن نیرنگ)

کچھ لوگ مونچھیں اس طرح مروڑتے بلکہ نچوڑتے ہیں کہ بالکل دھوبی لگتے ہیں۔(ہیئر کٹنگ)

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مہزاد کا مشاہدہ کس قدر گہرا ہے۔کتاب میں ہر مضمون کے ساتھ موضوع سے متعلق ایک دلچسپ تصویری خاکہ بھی شامل ہے۔جس سے کتاب کی قدر وقیمت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

اس سے پہلے بچوں کے لئے ''بدحواسیاں'' کے عنوان سے مصنف کی ایک اور کتاب بھی منظر عام پر آچکی ہے۔لیکن ''وارے نیارے'' کی اشاعت سے ان کا شمار باقاعدہ مزاح نگاروں کی صف میں ہوگیا ہے۔بہرحال ''وارے نیارے'' ہمارے شگفتہ ادب میں ایک خوبصورت اور سدا بہار شگفتہ اضافہ ہے۔امید ہے کہ مہزاد اس سلسلے کو جاری رکھیں گے اور یہ کتاب ان کی آئندہ کتاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

نعت شفق

قیام پاکستان کے بعد ادب میں تحریک اسلامی کے زیر اثر جو چند اہل قلم سامنے آئے ۔ان میں لالہ صحرائی مرحوم کا نام اس لحاظ سے نمایاں ہے کہ انہوں نے آخر دم تک نہایت ثابت قدم رہ کر تسلسل وتواتر کے ساتھ لکھا ۔اس سلسلے میں بیس سے زائد ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں ۔جن میں نثری مضامین اور خاکوں کے علاوہ ان کے نعتیہ مجموعوں کی تعداد زیادہ ہے ۔ان کی یہ تصانیف جہاں ان کے لئے سرمایہ بخشش ہیں وہاں اردو کے نعتیہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں ۔ ''لالہ زار نعت'' سے لے کر ''نعت شفق'' تک ان کے یہاں حب نبی کی روشنی اور سیرت رسول کی خوشبو موجزن محسوس ہوتی ہے ۔ان کی نعت میں عشق سرکار کی سرشاری کے ساتھ ساتھ ایک خاص احترام کا جذبہ کارفرما ہے ۔اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت نعت میں سیرت خیر الانام کی تبلیغ اشاعت بھی ہے ۔جو دور حاضر کی نعت کا ایک خاص پہلو ہے ۔

نعت شفق لالہ صحرائی کا آخری مجموعہ ہے جس کا شاید انہیں احساس ہو گیا تھا ۔چنانچہ کتاب کے آخر میں ان کی ایک ایسی نعت شامل ہے جس میں انہوں نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے ۔اس کا ایک شعر ہے

الوداع کہتا ہوں اب نعت نگاری کو میں
ڈھونڈے گا میرا تہا لفظ بقا میرے بعد

اس مجموعے میں غزلیہ پیرائے کے علاوہ قصیدہ، رباعی، سانیٹ، قطعہ اور ہائیکو کی صنف میں بھی نعت کا بیان ہے ۔ جو ایک طرح سے ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے ۔الغرض یہ مجموعہ نعت لالہ صحرائی ایسے محترم بزرگ کا ایک ایسا ادبی تبرک ہے جو اہل دل اور اہل نظر حضرات کے لئے کسی نعت سے کم نہیں ۔

اشکِ دوام

اردو میں مرثیہ نگاری کی تاریخ ہر عہد میں تر و تازہ رہی ہے اور ادبی دنیا پر ہمیشہ اپنے دیرپا اور مثبت اثرات چھوڑتی رہی ہے ۔مرثیہ کی صنف کو یہ خصوصیت حاصل رہی ہے کہ اس نے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور اپنے زمانے کے اجتماعی مزاج کو اپنے اندر سمونے کی بلیغ کوشش کی ہے اور بیش بہا اخلاقی معاشرتی اور مذہبی اقدار کو مسلسل یوں رکھا ہے کہ عہدِ حاضر بھی اس سے مستیر ہو رہا ہے ۔

ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ۔امر واقعی ہے کہ میر سے لے کر ڈاکٹر ابوالحسن نقوی تک ہر مرثیہ نگار نے سرکار مدینہ نبی کریمؐ اور ان کی آل اطہر کی مدح سرائی کر کے اپنی عاقبت روشن کی ہے ۔ڈاکٹر صاحب ملتان کے رہنے والے ہیں اور بیرون ملک میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہو کر خدمت خلق کر رہے ہیں ۔اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور اب ان کا تازہ مجموعہ مراثی ''اشکِ دوام'' مودتِ محمد و آل محمد کا منہ بولتا ثبوت ہے ۔وہ بیرون ملک رہ کر بھی اردو زبان و ادب سے اپنا قلبی تعلق جوڑے ہوئے ہیں ۔

زیر نظر مجموعہ ڈاکٹر صاحب کی جہاں صنف مرثیہ سے عملی دلچسپی کا مظہر ہے ۔وہاں واقعہ کربلا کے فیوض اور حب آل رسول کی برکات کے حصول کا ذریعہ بھی ہے ۔ڈاکٹر عاصی کرنالی مرحوم کے تاثرات کے علاوہ ڈاکٹر سید شبیہہ الحسن ہاشمی کا جامع پیش لفظ ''ڈاکٹر ابوالحسن نقوی کے مرثیوں میں عصری حسیت کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے ۔جس میں ہاشمی صاحب نے کتاب میں شامل تمام مرثیوں کا نہایت اختصار لیکن جامعیت سے جائزہ بھی لیا ہے اور دور حاضر کے ثنائی ادب میں ان تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے ۔بقول ''سید وحید الحسن ہاشمی مرحوم ڈاکٹر صاحب کے مرثیوں میں جدید مختصر مرثیے کے تمام لوازمات موجود ہیں اور انہوں نے صنف مرثیہ کو اپنے افکار سے زرخیز کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔

گُماں

''گُماں'' اُردواور پنجابی کے ممتاز شاعر میاں مقبول احمد کا تازہ مجموعہ کلام ہے۔اس سے پیشتر پنجابی میں ان کے دو مجموعے ''چھلاں'' اور ''گلاں'' کے نام سے اور اُردو میں ''نارسا''، ''محسبس'' اور ''میں نے کچھ پھول چنے'' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔''نارسا'' میں ان کی نظمیں ہیں۔ جبکہ ''محسبس'' میں غزلیں، اور ''میں نے کچھ پھول چنے'' میں ان کے شعری تراجم شامل ہیں۔

''گُماں'' اس لحاظ سے ان کی منفرد کتاب ہے۔کہ اس میں ایک ہی مختصر بحر اور ایک سے قافئے ردیف میں یعنی ایک ہی زمین میں ان کی مسلسل پچاس غزلیں شریک ہیں۔جو بذاتِ خود ایک تجربہ ہے۔گویا انہوں نے ایک طویل غزل یا دوسرے لفظوں میں پنجاہ غزلہ کہا ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔ان غزلوں میں زمانے کے اعتبار سے کہیں ماضی شکیہ کی فضا ہے اور کہیں مستقبل کی۔ یعنی ایسی فضا ہے جو یقین سے زیادہ گُماں سے قریب ہے۔اسی لئے غالباً اس کا عنوان ''گُماں' تجویز کیا گیا ہے۔

ان غزلوں کی زبان رواں دواں، شگفتہ اور سادہ ہے اور ان کا موضوع غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔گویا ان میں تغزل بھی ہے اور تفکر بھی۔اس لحاظ سے میاں صاحب کا یہ فنی تجربہ جہاں اپنے اندر معنوی وسعت وندرت اور تازگی لئے ہوئے ہے۔وہاں اس میں قاری کے لئے ایک دلچسپی بھی ہے۔

☆☆☆☆☆☆